قرآن کریم اور سنّت نبویہ علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام کی تعلیمات کا علمبردار

بیّنات

جلد: ۸۷   شمارہ: ۷

رجب المرجب: ۱۴۴۵ھ - فروری: ۲۰۲۴ء

قیمت فی شمارہ: ۶۰ روپے، زرِ سالانہ: ۷۰۰ روپے

مُدیر / مُدیر مسئول

مولانا سیّد سلیمان یوسف بنوری

نائب مُدیر

مولانا سیّد احمد یوسف بنوری

مُدیر معاوِن

مولانا محمد اعجاز مصطفیٰ

ناظم

مولانا فضل حق یوسفی

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ

دفتر ماہنامہ ’’بینات‘‘ جامعۃ العلوم الاسلامیۃ علامہ بنوری ٹاؤن

کراچی، پوسٹ کوڈ: 74800، پوسٹ بکس نمبر: 3465

فون دفتر ’’بینات‘‘: 021-34927233

بیرون ملک سے بذریعہ ہوائی ڈاک

یورپ اور امریکی ممالک، وغیرہ: 40 امریکی ڈالر

عرب اور ایشیائی ممالک، وغیرہ: 35 امریکی ڈالر

اکاؤنٹ نمبر

اکاؤنٹ نمبر: 0101900-397-7 برانچ کوڈ: 00816

مسلم کمرشل بینک علامہ بنوری ٹاؤن برانچ کراچی

وضاحت

ماہنامہ ’’بینات‘‘ میں اشتہارات کی اشاعت کا مقصد تصدیق اور سفارش نہیں ہے۔ ادارہ معاملات کا ذمہ دار نہیں ہوگا۔

جامعة العلوم الاسلامية

علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن

فون: 34913570 - 34123366 - 34121152 **Ext.** 146 - 147

فیکس: 92-21-34919531 +

Web: www.banuri.edu.pk ***Email***: bayyinat@banuri.edu.pk

ناشر: مولانا سید سلیمان یوسف بنوری **مطبع:** شفق پرنٹنگ پریس **طابع:** حافظ ثناء اللہ واحدی

فہرستِ مضامین

بصائر و عبر

انتخابات ۲۰۲۴ء اور کرنے کے کام!	۳	محمد اعجاز مصطفیٰ

مقالات و مضامین

مکاتیب حضرت مولانا احمد رضا بجنوریؒ بنام حضرت بنوریؒ	۷	انتخاب: مولانا سید سلیمان یوسف بنوری
لا مذہبیت کا فتنہ لادینیت پر جا کر ختم ہوتا ہے!	۱۰	حضرت مولانا محمد عبد الرشید نعمانیؒ
فضیلتِ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ	۱۳	جناب محمد جنادہ نعمانی
استاذ العلماء حضرت مولانا محمد سواتی رحمۃ اللہ علیہ	۲۲	مولوی سعید احمد بن وزیر محمد
ہیومن اِزم اور ہیومن رائٹس ... ملحدانہ افکار کا مطالعہ (قسط:۱)	۳۲	مولانا محمد احمد حافظ
اُمتِ مسلمہ کی خصوصیت ..... اعتدال اور میانہ روی	۳۸	مولانا عبد المتین
ماہِ رجب سے متعلق فضائل و احکام	۴۹	مولوی محمد طیب حنیف
ریاستِ اسرائیل ..... آخری سانسیں	۵۷	مرسلہ: ڈاکٹر ساجد خاکوانی

دار الافتاء

نماز میں اشارہ بالسبابہ (شہادت کی انگلی سے اشارہ کرنے) کا راجح طریقہ اور کیفیت کیا ہے؟	۶۰	ادارہ

نقد و نظر

زادُ الفقیر اردو شرح مقدمہ مسلم	۶۴	ادارہ

بصائر وعبر

انتخابات ۲۰۲۴ء اور کرنے کے کام!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلامٌ علٰی عبادہ الذین اصطفٰی

۸؍فروری ۲۰۲۴ء بظاہر انتخابات کی تاریخ مقرر ہوچکی ہے، اور الیکشن کمیشن کی طرف سے انتخابات کا مکمل شیڈول بھی سامنے آچکا ہے، جس کی بنا پر امیدواروں کے کاغذاتِ نامزدگی کی جانچ پڑتال شروع ہے۔ اور ۱۳؍جنوری تک حتمی امیدواروں کی فہرستیں سامنے آجائیں گی، لیکن دوسری طرف ملکی امن وامان کی صورتِ حال، ملک کے شمالی اور بالائی علاقوں میں سخت سردی اور برف باری، سیاسی قائدین پر حملوں اور انتخابی مہم میں رکاوٹوں کے باعث مقررہ تاریخ پر انتخابات کا انعقاد اگرچہ سوالیہ نشان بن چکا ہے، لیکن مقتدر حلقے بار بار اس بات کی یقین دہانی کروارہے ہیں کہ انتخابات اپنے وقت پر ہوں گے، اسی لیے انتخابات میں حصہ لینے والی سیاسی جماعتوں، ان کے امیدواران، ملک کی مقتدرہ اور اپنے ووٹ کی طاقت کا استعمال کرنے والی عوام کی خدمت میں چند اہم ضروری گزارشات پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

’’الدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ، قُلْنَا: لِـمَنْ؟ قَالَ: لِلّٰہِ وَلِکِتَابِہٖ وَ لِرَسُوْلِہٖ وَلِأَئِمَّۃِ الْمُسْلِمِیْنَ وَعَامَّتِہِمْ.‘‘ (مسلم، ج:۱،ص:۵۴، ط:قدیمی)

’’دین خیرخواہی کا نام ہے۔ صحابہؓ نے پوچھا: یہ خیرخواہی کس کے لیے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اللہ کے لیے، اللہ کی کتاب کے لیے، اللہ کے رسول کے لیے، مسلمانوں کے ائمہ کے لیے، اور تمام مسلمانوں کے لیے۔‘‘

اس جذبۂ خیر خواہی کے تحت عرض کرنا چاہیں گے کہ پاکستان' ایک نظریہ کے تحت وجود میں آیا تھا، قیامِ پاکستان میں نفاذِ اسلام بطورِ نعرہ استعمال ہوا، اور ’’پاکستان کا مطلب کیا؟ لا إلٰه إلا الله‘‘ کی گونج میں ایک آزاد اسلامی نظریاتی مملکت وجود میں آئی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ پاکستان کے معرضِ وجود میں آتے ہی یہاں اسلامی نظام نافذ کر دیا جاتا، لیکن اس کے برعکس ہوا یہ کہ نفاذِ اسلام کے نام پر یہ ملک کبھی صدارتی نظامِ حکومت اور کبھی فوجی مارشل لاؤں کی بھینٹ چڑھتا رہا، ہر آنے والا حکمران عوام کے سامنے اس خوش نما نعرے کی للکار میں اقتدار پر براجمان ہوتا اور اپنا وقت پورا کر کے چلتا بنا، عوام ایک بار پھر نئے آنے والے سے توقعات باندھ لیتے۔

ہر پانچ سال بعد انتخابی مہم کا ڈول ڈالا جاتا ہے اور عوام کے ووٹوں سے منتخب ہونے والوں کو پانچ سال کے لیے ملک کا مستقبل سنوارنے کا موقع دیا جاتا ہے، انتخابی مہم شروع ہوتے ہی عام طور پر سیاسی جماعتوں کا ہر امیدوار خود کو کامیاب بنانے کے لیے کبھی ڈراتا دھمکاتا ہے، اور کبھی منتیں ترلے کرتا ہے، کبھی بلند بانگ ارادے ظاہر کرتا ہے، کبھی جھوٹے وعدوں کے سبز باغ دکھاتا ہے، جب کہ جھوٹے وعدہ کرنے والوں کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

’’لِكُلِّ غَادِرٍ لِوَاءٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرْفَعُ لَهُ بِقَدْرِ غَدْرِهٖ أَلَا وَلَا غادِرَ اَعْظَمُ مِنْ أَمِيْرِ عَامَّةٍ.‘‘ (رواہ مسلم، بحوالہ مشکاۃ، ص: ۳۲۳، ط: قدیمی)

ترجمہ: ’’ہر بدعہدی کرنے والے کے لیے قیامت کے دن ایک جھنڈا ہوگا جو اس کی بدعہدی کے بقدر اس کے لیے اونچا کیا جائے گا۔ سنو! عوام کا حکمران اگر بدعہدی کرے تو اس سے بڑھ کر کوئی بدعہدی نہیں۔‘‘

بدعہدی سے مراد ہے: کسی کے ساتھ کوئی معاہدہ کر کے اس کو توڑ دینا اور کسی کے ساتھ وعدہ کر کے اسے پورا نہ کرنا۔ عہد شکنی اور وعدہ خلافی بہت ہی بڑا گناہ ہے۔ یوں تو بدعہدی اور بے وفائی سب کے لیے بری چیز ہے، لیکن اگر اس عہد شکنی اور بے وفائی کا اظہار حکمرانوں کی طرف سے ہو تو یہ بہت زیادہ سنگین جرم ہے اور اس کی سزا بھی اسی نسبت سے شدید ترین ہوگی۔ انتخابی مہم چلانے والے امیدواروں کو ہمہ وقت ان فرامینِ نبوی کا استحضار رکھنا چاہیے کہ ان کے منہ سے کوئی ایسا وعدہ نہ نکلے، جس کی وہ پاسداری نہ کر سکیں، ورنہ آخرت میں ذلت و رسوائی ان کا مقدر بن جائے گی۔

حکمرانی کے خواہش مندوں کو یہ حقیقت ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ سدا حکمرانی صرف اللہ تعالیٰ کی ہے،

اس لیے کہ تخت پر براجمان ہونے والوں کا مقدر تختہ دار یا سلاخوں کے پیچھے بنتے دیر نہیں لگتی۔ درسِ موعظت و عبرت ہے کہ کل تک ایک دہائی مطلق العنانی کا خواب دیکھنے والے قیدی بنا دیے گئے اور ماضی میں قید کاٹنے والے آئندہ حکمرانی کے لیے مضبوط اُمیدار بن کر سامنے آرہے ہیں۔ آئندہ حکمرانوں کو بھی اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے کہ جانے کب کس وقت وہ عزت کی ثریا سے ذلت کے پاتال میں پھینک دیے جائیں، اس لیے کبھی بڑے بول بولنے، تکبرانہ سوچ رکھنے اور بس خود ہی کو ناگزیر سمجھنے کی خوش فہمی کا شکار نہیں بننا چاہیے۔ سیاسی جماعتوں کے امیدواران جتنا حقیقت شناس ہوں گے، اتنا ہی ان کے حق میں بہتر ہوگا۔

ووٹ ڈالنے والے عوام پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ دیکھ بھال کر، سوچ سمجھ کر، اور چھان پھٹک کر، ایسے لوگوں کو حکمرانی کے لیے منتخب کریں، جو دینِ اسلام کے وفادار اور اپنے ملک عزیز پاکستان کے جاں نثار ہوں۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں کے تحفظ پر یقین رکھتے ہوں، عوامی خدمت جن کا شعار اور خدا کی عبادت کرنا جن کا معمول ہو، خلقِ خدا کی ایذا رسانی سے ڈرتے ہوں، قول وعمل کے کھرے ہوں، خصوصاً بین الاقوامی اور ملّی و دینی معاملات میں غیرت وحمیت سے سرشار ہوں، چنانچہ پاکستان کے عوام کی ذمہ داری بن جاتی ہے کہ اپنے حقِ انتخاب کی طاقت کا درست اور صحیح استعمال کریں اور ایسے امیدواروں کو کامیاب کرائیں جو عالمی سطح پر امتیازی شان کے ساتھ اسلامی ملّی مسائل میں مؤثر اور قائدانہ کردار ادا کرسکیں۔

ہمارے عوام کو بھولنا نہیں چاہیے کہ ہمارے علماء کے ہاں ووٹ ایک شہادت ہے۔ ووٹ ڈالنے والا اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ جس کو منتخب کرنے جارہا ہوں، یہ واقعی اس کا اہل ہے۔ خدانخواستہ اگر کسی نااہل کو منتخب کیا تو یہی ووٹ ہمارے خلاف شہادت بن سکتا ہے۔ ووٹ کی پرچی ایک طرح سے اپنی حکمرانی کے لیے کسی نمائندہ پر اعتماد کا اظہار اور اسے اپنی بیعت کا یقین دلانا بھی ہے۔ اپنا سیاسی امام چنتے وقت خدائی معیار کو بھی مدِ نظر رکھنا چاہیے، قرآن کریم میں ارشادِ الٰہی ہے: ’’اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ‘‘ (الحجرات:۱۳) ترجمہ: ’’تحقیق عزت اللہ کے ہاں اسی کو بڑی جس کو ادب بڑا۔‘‘ اس آیتِ کریمہ کے تحت مولانا سید محمد میاںؒ لکھتے ہیں: ’’سیاسی نظام میں چوٹی کا فرد یعنی سربراہ وہ ہونا چاہیے جو سب سے زیادہ متقی ہو، یعنی تزکیۂ نفس میں بڑھا ہوا ہو۔ اللہ کے یہاں سب سے زیادہ مستحقِ احترام وہ ہے جو سب سے زیادہ خداترس اور پرہیزگار ہو۔ (سیرتِ محمد رسول اللہ، ص:۵۶۶)

یعنی مسلمانوں کا سربراہ وہ ہونا چاہیے جو سب سے زیادہ متقی ہو، خداترس اور پرہیزگار ہو، خدا خوفی اس کا وطیرہ ہو۔ جب ملک کا حکمران ان صلاحیتوں سے معمور ہوگا تو مالی بدعنوانی اور بددیانتی جو آج ہمارے معاشرے کا ناسور اور ملک کو کرپشن کی صورت میں دیمک کی طرح کھارہی ہے، اس سے بچے گا اور

عوام کا پیسہ ان کی فلاح و بہبود اور ملکی مسائل کی ترقی پر خرچ کرے گا۔

بعض لوگ ووٹ کا استعمال ہی نہیں کرتے اور کہا یہ جاتا ہے کہ ہماری نظر میں کوئی صحیح نہیں تو کیوں ووٹ دیں؟ یہ کم ہمتی اور پست حوصلگی ہے، اس سے بچنا چاہیے، اس لیے کہ بندے کے ذمے کوشش اور اپنے طور پر صحیح آدمی کو ووٹ دینا ہے، نتیجہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے، ہمیں اپنی ذمہ داری کو ضرور پورا کرنا چاہیے۔ ووٹ کا درست استعمال کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے مانگے کہ یا اللہ! میں نے اپنی سمجھ کے مطابق درست امیدوار کا انتخاب کیا ہے، اگر میں غلط ہوں تو مجھے معاف فرما اور اس کے شر سے ہم سب کی حفاظت فرما۔ اور اگر میں درست ہوں تو اس کے ثمرات سے پوری پاکستانی قوم کو مستفید فرما۔ اسی طرح بعض لوگ شبہات پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ موجودہ طریقۂ انتخابات اور سیاسی نظام مکمل غیر اسلامی اور غیر شرعی ہے اور اس میں حصہ لینے والے نعوذ باللہ! کفر کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ یہ سوچ بھی اسلام سے ہم آہنگ نہیں ہے، اس لیے کہ اس کا فائدہ غیر سیاسی اور غیر جمہوری طاقتیں اٹھاتی ہیں جو عالمی سامراج امریکا و برطانیہ کی پٹھو ہیں۔ مشاہدہ ہے کہ اس قسم کے خیالات رکھنے والے عام طور پر بادشاہی، صدارتی اور فوجی نظام کے حامی ہوتے ہیں جو دراصل ڈکٹیٹرشپ اور شخصی حکومتیں ہوتی ہیں، اور بیرونی قوتوں کو ان سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص سے کبھی دھمکی اور کبھی لالچ سے اپنی بات منوانا آسان ہوتا ہے، بنسبت ایک منتخب حکومت کے، جیسا کہ نائن الیون کے بعد اس وقت کے ڈکٹیٹر پرویز مشرف سے امریکا نے دھمکی کے ذریعے جو چاہا، منوالیا، اسی لیے اسلام میں شخصی حکومت کی گنجائش نہیں، بلکہ اسلام مشاورت کے ساتھ حکومت بنانے، قائم رکھنے اور چلانے کا حکم دیتا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:

۱: ''وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ'' (آل عمران:۱۵۹): ''اور ان سے مشورہ لے کام میں۔''

۲: ''وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ'' (الشوریٰ:۳۸) ''اور کام کرتے ہیں مشورے سے آپس کے۔''

یہ ضرور ہے کہ موجودہ جمہوری سیاسی نظام میں بہت کچھ خرابیاں ہیں، جن کی اصلاح ضروری ہے، لیکن اس پورے نظام کو یکلخت غیر شرعی اور غلط قرار دینا بھی صحیح اور درست نہیں، بلکہ ایک طرح سے مطلق العنان آمریت اور فسطائیت کی راہ ہموار کرنے کے مترادف ہے، حال اور ماضی کے کئی واقعات اس پر شاہد ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ آئندہ انتخابات ملک وقوم کے لیے نیک شگون ثابت ہوں اور یہ انتخابات دینی ودنیاوی ترقی اور اُخروی عزت وسرخروئی کا سبب اور ذریعہ بنیں، آمین بجاہ سید المرسلین!

و صلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہٖ سیدنا محمد و علیٰ آلہٖ و صحبہٖ أجمعین

سلسلۂ مکاتیب حضرت بنوریؒ

حضرت مولانا احمد رضا بجنوری رحمۃ اللہ علیہ

بنام حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ

انتخاب: مولانا سید سلیمان یوسف بنوری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

از بجنور، چاہ شیریں (محلہ)

۳۰/ اکتوبر سنہ ۱۹۳۷ء

محترم بندہ، دام مجدُکم و عمّت مکارمکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

گرامی نامہ نے مسرور کیا، اُمید (ہے) کہ آپ پشاور پہنچ گئے ہوں گے، اور کچھ مشورہ بھی دہلی بھیج دیا ہوگا، بقیہ پشاور سے پتہ ذیل پر بھیج دیجیے: (مولوی عبدالسلام صاحب کاتب بلندشہری، بر مکانِ اکرام الدین صاحب کارخندار (کارخانہ دار)، پنڈٹ کا کوچہ، دہلی)۔

میں الیکشن کی وجہ سے کہیں نہیں جا سکا، ایک حلقہ میرے بھی سپرد تھا، الحمد للہ ۲۷ کو الیکشن خیر وخوبی سے گزر گیا، اور حافظ صاحب کو ۸۰ فیصد ووٹ حاصل ہوئے، ۶/ نومبر کو نتیجہ بھی سنا دیا جائے گا۔ احرار کانفرنس بٹالہ میں کیا کچھ دیکھا؟ مطلع کریں۔ غالباً تعطیلِ رمضان میں قیام پشاور ہی (میں) رہا ہوگا۔ ’’مشکلاتُ القرآن‘‘ سب طبع ہوچکی، اب مقدمہ ہی باقی ہے۔ میں دو چار روز میں شاید دہلی جاؤں۔

والد صاحب کچھ علیل ہیں، دعاء صحت کیجیے گا۔ مخدومی ماموں صاحب (مولانا فضل صمدانی صاحب رحمہ اللہ) کی خدمت میں سلام فرمائیں۔

افریقہ سے حال میں کوئی خط نہیں آیا، میں نے لکھ دیا ہے۔ مفتی (مہدی حسن شاہ جہان پوری) صاحب کا خط ملا، لکھا ہے کہ مہتمم صاحب کا کوئی پرچہ میرے نام تھا، وہ آپ کو دے دیا تھا، شاید آپ یہاں بھیجنا بھول گئے، بہرحال مضمون سے مطلع کریں، غالباً کوئی خاص بات نہ ہوگی، اگر پرچہ موجود ہو تو وہی بھیج دیں۔

معلوم ہوا کہ ندوی صاحب، سہروردی صاحب، اور ابو الفرح صاحب کے درجوں کا نتیجۂ امتحان اچھا نہیں رہا، آپ کو اس کے بارے میں کچھ علم ہو تو لکھیں۔ والسلام

احقر احمد رضا عفا اللہ عنہ

از بجنور

پس نوشت: کل سہروردی صاحب کا بھی خط آیا، وہ جا کر بیمار ہو گئے تھے، الحمد للہ کہ اب اچھے ہیں، آپ بھی عیادت کا خط لکھ دیں۔

از بجنور، چاہ شیریں (محلہ)

۲۵/مئی سنہ ۱۹۳۹ء

مکرم بندہ، جناب مولانا محمد یوسف صاحب، زاد مجدُکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

کل گرامی نامہ صادر ہوا، خیریت وحالات سے اطمینان ہوا۔ میں دیوبند نہ جا سکا، اور نہ اب جانے کا قصد ہے، عزیز مولوی ازہر شاہ سلمہ (علامہ کشمیری رحمہ اللہ کے بڑے صاحب زادے) کے دعوتی خطوط بھی آئے، لیکن اب شعبان تک کے لیے وہاں کا عزم نہیں ہے۔ آپ چونکہ دیوبند ہو کر ڈابھیل جائیں گے، اس لیے میں نے آج ہی عزیز موصوف کو خط لکھ دیا ہے کہ وہ آپ کو ''آثار السنن'' (بظاہر ''آثار السنن'' پر علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیقات بنام ''الإتحاف لمذهب الأحناف'' مراد ہیں) اور دوسری مفید وکار آمد یادداشتیں دے دیں گے، اچھی طرح تاکید سے لکھ دیا ہے۔ امید ہے کہ وہ آپ کو ضرور دے دیں گے، آپ رسیدی یادداشت ان کو دے دیں کہ فلاں فلاں کتاب ان سے ''مجلسِ علمی'' کے لیے آپ نے لی ہیں۔ میرا قصد کل کو جمعیۃ علماء کے جلسۂ مرادآباد جانے کا ہے، مولانا مشیت اللہ صاحب (بجنوری) وہاں بھی جا رہے ہیں، وہاں سے ۲۸ / ۲۹ تک واپس آ کر دوسری جون تک عازمِ ڈابھیل ہوں گا۔ اگر اس وقت آپ بھی دہلی پہنچ گئے تو وہاں سے سفر ساتھ ہو جائے گا، ورنہ خیر!

کتابوں کے متعلق آپ کو تفصیلی حالات ڈابھیل سے پہنچے ہوں گے، افسوس کہ نقصان بہت ہو گیا، اب فکر اس کو کم کرنے کی ہے، امید ہے کہ بمبئی جا کر سعی کرنے سے .... کی نصف رقم واپس مل جائے گی۔ مہتمم صاحب کا بھی خط آیا ہے، وہ بھی بمبئی جانے والے ہیں، اور اس سلسلہ میں بھی سعی کریں گے، خدا کامیاب کرے۔ والسلام

احمد رضا عفا عنہ

۲۵؍ نومبر سنہ ۱۹۳۹ء

۱۳؍ شوال سنہ ۱۳۵۸ھ

مکرم ومحترم مولانا محمد یوسف صاحب زاد مجدُکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

عنایت نامہ مورخہ ۳۱؍اکتوبر ملا تھا، میں جس وقت سے یہاں آیا، بھتیجی کی علالت کے باعث عدیم الفرصت رہا، اور اس وجہ سے کوئی کام وقت پر نہ ہوسکا، خصوصًا ڈاک کا کام بہت گڑبڑ رہا۔ افسوس کہ باوجود علاج ہر قسم کے مریضہ نے تین دن قبل انتقال کیا، جوان موت ہوئی، صرف تین ماہ بیمار رہی، ایک بچہ یادگار چھوڑا ہے۔ آپ کے خط کے جواب کا بھی کئی بار قصد کیا، مگر نہ ہوسکا۔ مرحومہ کے لیے دعاء مغفرت کریں۔

والد صاحب قبلہ (مولانا محمد زکریا بنوری رحمہ اللہ) کے معاملہ میں پھر کیا ہوا؟ لکھیے گا۔ محرم صاحب کا خط' مصر سے آیا ہے، آپ کو بھیجتا ہوں۔ حنبولی وغیرہ کا بھی لفافہ ملا ہے، وہ بھی اچھی طرح ہیں۔ استاذ حبیب صاحب ابھی تک نہیں لوٹے، وہاں بھی انتظار ہورہا ہے۔ حنبولی وغیرہ نے بھی آپ کو سلام لکھا ہے۔

ڈابھیل کے حالات میں یہ خبر افسوس ناک ہے کہ گارڈی وغیرہ کی اپیل کامیاب ہوگئی، مہتمم صاحب اور دونوں باہر کے ممبر مجلس سے علیحدہ کیے گئے، اور ڈابھیل کے چار، سملک کے دو ممبر برقرار رہے، گویا فیصلہ بالکل خلاف ہوا۔ اب مہتمم صاحب نے پھر اپیل کی ہے، خدا بہتر کرے۔ غالبًا مدرسہ کے عملہ میں کوئی تغیر نہ ہوگا، اگرچہ مولانا مدظلہ (بظاہر مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ) کے ڈابھیل جانے کی قوی اُمید نہیں ہے، اس لیے بھی کہ مولانا حسین احمد صاحب (مدنی) مدینہ منورہ جارہے ہیں، مولانا سید احمد صاحب (مدینہ طیبہ میں مقیم حضرت مدنی کے برادرِ مکرم) سخت علیل ہیں، اور ممکن ہے مولانا کو وہاں زیادہ عرصہ تک قیام کرنا پڑے۔

آپ مہتمم صاحب کو ایک دوسبق کے لیے لکھ دیں یا مجلس کو پورا وقت دیں، اختیار ہے، لیکن اسباق ہوں تو اس طرح کہ ایک ہی وقت کے مسلسل گھنٹے ہوں، اس میں سہولت ہوگی۔ میرا ارادہ شروع ذیقعدہ میں ڈابھیل جانے کا ہے، ابھی یہاں گھر کے کچھ ضروری کاموں میں مشغول ہوں۔ آپ کب تک پہنچیں گے؟ لکھیے۔ اگر بجنور بھی تشریف لاسکیں تو بہت اچھا ہوگا، احباب اور بزرگوں کو ملاقات کا اشتیاق ہے۔

والسلام

احقر احمد رضا عفا اللہ عنہ

لامذہبیت کا فتنہ لادینیت پر جاکر ختم ہوتا ہے!

حضرت مولانا محمد عبدالرشید نعمانی رحمۃ اللہ علیہ
سابق مُشرف تخصصِ علومِ حدیث، جامعہ

حامداً و مصلیاً و مسلماً: أما بعد:

دین کی کچھ باتیں تو ایسی سادہ اور آسان ہوتی ہیں کہ جن کے جاننے میں سب خاص و عام برابر ہیں، جیسے وہ تمام چیزیں جن پر ایمان لانا ضروری ہے، یا مثلاً وہ احکام جن کی فرضیت کو سب جانتے ہیں، چنانچہ ہر ایک کو معلوم ہے کہ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج ارکانِ اسلام میں داخل ہیں، لیکن بہت سے مسائل ایسے ہیں جو عوام کی سمجھ میں نہیں آتے، اس لیے ان کو علماء سے پوچھنا ضروری ہے۔

یہ وہ مسائل ہیں جن کو اہلِ علم قرآن وحدیث میں غور کرنے کے بعد سمجھتے ہیں اور علماء کو بھی ان مسائل کے سمجھنے کے لیے شرعی طور پر ایک خاص علمی استعداد کی ضرورت ہے، جس کا بیان اصولِ فقہ کی کتابوں میں تفصیل سے مذکور ہے، بغیر اس استعداد کے حاصل ہوئے کسی عالم کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی مشکل آیت کی تفسیر کرے، یا کوئی مسئلہ قرآن وحدیث سے نکالے۔ جس عالم میں یہ استعداد پیدا ہوجاتی ہے اور پھر وہ اپنی پوری کوشش صرف کرکے قرآن وحدیث سے مسئلہ نکالتا ہے، اس کو مجتہد کہا جاتا ہے اور جس شخص میں یہ استعداد نہ ہو وہ عامی ہے، عامی کو یہ حکم ہے کہ ہر مسئلہ میں مجتہد کی طرف رجوع کرے اور مجتہد کا یہ فرض ہے کہ وہ جو مسئلہ بھی بیان کرے، کتاب وسنت میں خوب غور کرکے اور اپنی پوری کوشش صرف کرکے اولاً اس مسئلہ کو سمجھے اور پھر اس پر فتویٰ دے۔

اجتہاد و فتوی کا یہ سلسلہ عہدِ نبوی سے لے کر آج تک اُمت میں رائج چلا آرہا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی بہت سے ایسے حضرات صحابہ کرامؓ میں تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے خود مدینہ شریف میں اور تمام ملکِ عرب میں جہاں اسلام پھیل چکا تھا‘ فتویٰ دیا کرتے تھے اور

سب لوگ ان کے فتوی پر عمل کیا کرتے تھے۔ صحابہ کرامؓ کے بعد تابعینؒ کے دور میں بھی یہ سلسلہ اسی طرح قائم رہا، بلکہ ہر شہر کے مفتی اور مجتہد جو مسائل بیان کرتے تھے اس شہر کے رہنے والے انہی کے فتاوی کے مطابق تمام احکامِ دین پر عمل پیرا ہوتے تھے۔ پھر تبع تابعینؒ کے دور میں ائمہ مجتہدینؒ نے کتاب وسنت اور گزشتہ مجتہدین صحابہؓ وتابعینؒ کے فتاوی کو سامنے رکھ کر زندگی کے ہر باب میں تفصیل سے احکام مرتب کردیئے۔ ان ائمہ میں اولیت کا شرف امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو حاصل ہے، پھر امام مالک اور ان کے بعد امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین ہیں۔

چونکہ ان ائمہ اربعہ رحمۃ اللہ علیہم نے زندگی میں پیش آنے والے اکثر وبیشتر مسائل کو جمع کردیا تھا اور ساتھ ہی وہ اُصول بھی بیان کردیئے تھے کہ جن کی روشنی میں یہ احکام مرتب کیے گئے تھے، اس لیے تمام اسلامی دنیا میں قاضیوں اور مفتیوں نے انہی کے مسائل کے مطابق فیصلہ کرنا اور ان پر فتوی دینا شروع کردیا، اس طرح تمام عالم اسلامی میں ان حضرات کے مذاہب مقبول ومعتمد ہوگئے، چنانچہ یہ سلسلہ دوسری صدی سے لے کر آج تک اسی طرح قائم ودائم ہے۔

ہندوستان میں جب انگریز کی عملداری شروع ہوئی تو اس زمانہ میں کچھ لوگوں کے سر میں یہ سودا سمایا کہ ہمیں اگلوں کے فتاوی پر چلنے اور ان کی تقلید کرنے کی کیا ضرورت ہے؟! ہمیں تو خود قرآن وحدیث سے مسئلے نکالنے چاہئیں، یہ لوگ اپنے آپ کو اہلِ حدیث یا غیر مقلد کہتے ہیں، لیکن حقیقت میں یہ بھی مقلد ہی ہیں۔ ان کے عوام تو مسجد کے مولوی ملاؤں سے مسئلے پوچھ پوچھ کر ان پر عمل کرتے ہیں اور یہ خود حدیث کی کچھ کتابوں کو سامنے رکھ کر علمائے شوافع نے جو اُن کا مطلب بیان کیا ہے اس پر چلتے ہیں۔

حدیث کی تصحیح وتضعیف اور راویانِ حدیث کی جرح وتعدیل میں بھی یہ محدثین ہی کے مقلد ہیں، چنانچہ بطور مثال ان کے نزدیک امام بخاریؒ یا امام ترمذیؒ کا کسی حدیث کو صحیح یا ضعیف کہنا اس حدیث پر عمل کرنے یا نہ کرنے کے لیے کافی ہے، حالانکہ انہیں پتہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ حدیث کیوں صحیح ہے؟ یا کیوں ضعیف ہے؟ غرض اس بارے میں یہ بخاریؒ وترمذیؒ کی تقلید کو کافی سمجھتے ہیں اور اس باب میں اجتہاد نہیں کرتے۔

اس عدمِ تقلید کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہندوستان میں دین ومذہب کے اندر فتنوں کے دروازے کھل گئے، ہر شخص مجتہد بن بیٹھا، چنانچہ سب سے پہلے سرسید احمد خان نے اس راہ میں قدم رکھا، پہلے حنفی مذہب کو خیر باد کہا، تقلید سے منہ موڑا، غیر مقلد ہوئے، پھر ترقی کرتے کرتے نیچریت پر معاملہ جا پہنچا، اور ظاہر ہے کہ جب فقہاء کی تقلید حرام ٹھہری تو تصحیح وتضعیف میں کسی محدث کی کیوں سنی جائے؟ اور بغیر دلیل سمجھے اس کو کیوں

صحیح مان لیا جائے؟! یہی حال غلام احمد قادیانی کا ہوا، وہ مذہبِ حنفی سے نکلا اور غیر مقلدیت میں بڑھتے بڑھتے معاملہ یہاں آ کر ٹھہرا کہ مہدی سے بھی آگے بڑھ کر مسیح موعود کے منصب پر اپنے کو پہنچا دیا۔

دوسری طرف اس انکارِ تقلید نے انکارِ حدیث کی راہ دکھلائی، چنانچہ اسلم جیراج پوری کے دادا حنفی تھے، ان کے باپ مولوی سلامت اللہ غیر مقلد بنے، اسلم جیراج پوری نے باپ دادا سے بھی ایک قدم آگے بڑھایا تو انکارِ حدیث کے داعی بن گئے اور ان کے نام لیوا مسٹر پرویز کی زندگی کا مشغلہ ہی حدیث وسنت کا مذاق اُڑانا رہ گیا۔ اسی طرح ملک میں جتنے دوسرے دینی فتنے ہیں، وہ سب انکارِ تقلید کے شاخسانے ہیں۔ پہلے آدمی تقلید سے منکر ہوتا ہے، غیر مقلد بنتا ہے اور پھر اس کی خودرائی اُسے گمراہی کے گڑھے میں ڈالے بغیر نہیں رہ سکتی۔

تاریخ شاہد ہے کہ جب سے مذاہبِ اربعہ کا رواج ہوا، مسلمانوں میں نئے نئے فرقے پیدا ہونے بند ہو گئے تھے اور جب سے تقلید کا بند ٹوٹا ہے اور لامذہبی کا دور دورہ ہوا ہے، ہر طرف نئے نئے فتنے سر اُٹھانے لگے ہیں۔ آج کل خود کراچی شہر میں ہی دو نئے فتنے زور سے سر اُٹھا رہے ہیں:

ایک فتنہ کراچی کے ساحل سے توحید کے نام پر اُٹھ رہا ہے، چنانچہ وہاں سے کتابچے ''توحید خالص'' کے نام سے شائع ہو رہے ہیں، ان میں یہی بتایا جا رہا ہے کہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر آج تک کوئی توحید کا حامل ہی نہیں رہا اور خاص کر ہندوستان کو تو تصوف نے ایسا تباہ کیا کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ تک ایک بھی مسلمان کہلانے کے لائق نہیں، اس فتنہ کا سربراہ ایک نامسعود شخص تھا جو حال میں فوت ہو گیا۔

دوسرا فتنہ کراچی شہر کی دوسری سمت سے سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے نام سے برپا کیا گیا ہے، جس کا مقصد ناصبیت کو زندہ کرنا ہے۔ اس فتنے کا سربراہ یزید اور مروان کا فدائی ہے اور ان کی پوری کوشش یہ ہے کہ جس طرح بھی بن پڑے حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرات حسنین رضی اللہ عنہما اور ائمہ اہل بیتؒ کو گو سا جائے اور اُن کی عظمت کو پامال کیا جائے۔ اس فتنہ کا سربراہ نامحمود عباسی تھا، وہ تو مر گیا، اب اس کے چیلے چانٹے اس فتنہ کو ہوا دے رہے ہیں۔

ان دونوں فتنوں کی خرابی اور نقصان کا اندازہ لگانا ہو تو ان کے یہاں سے اس سلسلہ میں جو کتابچے شائع کیے جاتے ہیں ان کو دیکھ لیا جائے کہ کس قدر گمراہی پھیلا رہے ہیں۔

..... ❀ ..... ❀ ..... ❀ .....

فضیلتِ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ

جناب محمد جنادہ نعمانی

کیا حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کی فضیلت ثابت نہیں؟

سیدنا حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما پر مطاعن ومثالب کی بھرمار کی جاتی ہے، کیے جانے والے اعتراضات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپؓ کے فضائل میں احادیث موجود نہیں ہیں یا یہ کہ احادیثِ صحیحہ نہیں ہیں کہ جن سے آپ کی فضیلت ثابت ہوسکے۔ نہ جانے اس اعتراض کا مقصد کیا ہے؟ لیکن عام طور پر جس پیرائے میں یہ اعتراض اُچھالا جاتا ہے، اس سے مقصود ومراد واضح ہوجاتی ہے۔

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے فضائل کے بیان میں اول تو یہ بات خوب ذہن نشین رہنی چاہیے کہ وہ تمام فضائل ومناقب جو مطلقاً بغیر کسی تقیید وتخصیص کے مجموعی طور پر جماعتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں وارد ہوئے ہیں، ان کا مصداق جہاں پوری جماعتِ صحابہؓ ہے، بعینہٖ اسی طرح ان فضائل وکرامات میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی برابر کے شریک وسہیم ہیں۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ان چند منتخب اور چنیدہ بختاور افراد میں سے ہیں جن کو بارگاہِ نبوت علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کتابتِ وحی کا منصب عطا تھا اور وہ وحیِ الٰہی لکھا کرتے تھے۔ بعض مفسرین کی تفسیر کے مطابق ان کاتبینِ وحی کی فضیلت، کرامت اور شرافت قرآنِ حکیم نے بیان کی ہے: ''بِأَيْدِيْ سَفَرَةٍ، كِرَامٍ بَرَرَةٍ'' (العبس: ۱۵،۱۶) یعنی یہ قرآن ایسے لکھنے والوں کے ہاتھ میں ہے جو باعزت، پاکباز اور نیکوکار ہیں۔

علاوہ ازیں خاص آپؓ کے بھی بہت سے فضائل وارد ہوئے ہیں، سردست چند ایک پیشِ خدمت ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ هَادِيًا مَّهْدِيًّا وَاهْدِ بِهٖ.'' (جامع ترمذی، رقم الحدیث: ۳۸۴۲)

ترجمہ: ''اے اللہ! معاویہؓ کو دوسروں کے لیے راہبر و راہنما اور ہدایت یافتہ بنا اور ان کے ذریعے ہدایت پھیلا۔''

اس روایت کو خود امام ترمذیؒ نے حسن قرار دیا ہے، اور حدیثِ حسن محدثین کے ہاں مقبول ہے۔

دوسری حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سیدنا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے دعا فرمائی:

''اللّٰهُمَّ عَلِّمْ مُعَاوِيَةَ الْكِتَابَ وَالْحِسَابَ وَقِهِ الْعَذَابَ .''

(مسند احمد: ۲۸ / ۳۸۳، رقم الحدیث: ۱۷۱۵۲)

ترجمہ: ''اے اللہ! معاویہؓ کو کتاب اللہ اور حساب کا علم عطا فرما اور عذاب سے محفوظ فرما۔''

اس حدیث کے بارے میں علّامہ عبدالعزیز پڑہاروی رحمہ اللہ نے صحت کا لکھا ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو قیمتی نصائح سے بہرہ ور فرمایا:

''حَدَّثَنَا رَوْحٌ، قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُوْ أُمَيَّةَ عَمْرُو بْنُ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ، قَالَ: سَمِعْتُ جَدِّيْ، يُحَدِّثُ، أَنَّ مُعَاوِيَةَ، أَخَذَ الْإِدَاوَةَ بَعْدَ أَبِيْ هُرَيْرَةَ يَتْبَعُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِهَا، وَاشْتَكَى أَبُوْهُرَيْرَةَ، فَبَيْنَا هُوَ يُوَضِّئُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَفَعَ رَأْسَهُ إِلَيْهِ مَرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ وَهُوَ يَتَوَضَّأُ ، فَقَالَ: يَا مُعَاوِيَةُ! إِنْ وُلِّيْتَ أَمْرًا فَاتَّقِ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ وَاعْدِلْ .'' (مسند احمد، رقم الحدیث ۱۶۹۳۳)

ترجمہ: ''حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے بعد پانی کا لوٹا لے کر رسول اللہ ﷺ کے پیچھے چل رہے تھے، حضرت ابوہریرہؓ بیمار تھے، اس دوران کہ حضرت معاویہؓ رسول اللہ ﷺ کو وضو کروا رہے تھے، آنحضور ﷺ نے وضو کے دوران ہی ایک دو دفعہ اُن کی طرف سر اٹھایا اور فرمایا: اے معاویہ! اگر تمہیں حکومت دی جائے تو تقویٰ اختیار کرنا اور عدل و انصاف سے کام لینا۔''

اس حدیث کے تمام راوی ثقہ ہیں اور صحیح بخاری کے رواۃ ہیں۔

ایسی روایت بھی سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی فضیلت میں موجود ہے جو محدثین کے ہاں صحیح ہے، چنانچہ صحیح بخاری میں ہے:

''عَنْ خَالِدِ بْنِ مَعْدَانَ، أَنَّ عُمَيْرَ بْنَ الْأَسْوَدِ الْعَنْسِيَّ، حَدَّثَهُ أَنَّهُ أَتَى عُبَادَةَ بْنَ الصَّامِتِ وَهُوَ نَازِلٌ فِيْ سَاحَةِ حِمْصَ وَهُوَ فِيْ بِنَاءٍ لَهُ، وَمَعَهُ أُمُّ حَرَامٍ، قَالَ:

عُمَيْرٌ، فَحَدَّثَتْنَا أُمُّ حَرَامٍ: أَنَّهَا سَمِعَتِ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، يَقُولُ: أَوَّلُ جَيْشٍ مِّنْ أُمَّتِيْ يَغْزُوْنَ الْبَحْرَ قَدْ أَوْجَبُوْا، قَالَتْ أُمُّ حَرَامٍ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ! أَنَا فِيْهِمْ؟ قَالَ: أَنْتِ فِيهِمْ، ثُمَّ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَوَّلُ جَيْشٍ مِنْ أُمَّتِيْ يَغْزُوْنَ مَدِيْنَةَ قَيْصَرَ مَغْفُورٌ لَهُمْ، فَقُلْتُ: أَنَا فِيْهِمْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: لَا.''

''عمیر بن اسود عنسی کہتے ہیں کہ حمص کے ساحل پر عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ اپنے مقام پر فروکش تھے اور آپ کے ساتھ آپ کی زوجہ محترمہ اُم حرام بنت ملحان رضی اللہ عنہا بھی رفیقِ سفر تھیں، اس موقع پر جناب ام حرام رضی اللہ عنہا نے یہ بیان فرمایا کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ میری اُمت کا پہلا لشکر جو سمندری جہاد کرے گا اس نے اپنے اوپر جنت واجب کرلی، حضرت ام حرامؓ نے عرض کی! یارسول اللہ! کیا میں ان میں شریک ہوں گی؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم ان میں شامل ہو، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری اُمت کا پہلا لشکر جو مدینہ قیصر سے جہاد کرے گا، اس کی بخشش کردی جائے گی، حضرت ام حرامؓ نے کہا کہ یارسول اللہ! کیا مجھے اس میں شمولیت نصیب ہوگی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں۔''

محقق العصر حضرت مولانا محمد نافع صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

''محدثین کے نزدیک یہ ایک امرِ مسلم ہے کہ پہلی بار غزوۂ بحر جو ۲۷ھ میں پیش آیا تھا اور جس کو غزوۂ قبرص کہتے ہیں، اس میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ اور ان کی اہلیہ محترمہ ام حرامؓ شامل تھیں، اس بحری غزوہ کے امیرِ جیش حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ تھے اور ان کی زوجہ محترمہ فاختہؓ بنت قرضہ نامی ان کے ہم راہ تھیں، اس جیش کے حق میں زبانِ نبوت سے مژدہ ثابت ہے، فلہٰذا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے یہ ایک بہت بڑی فضیلت ہے اور اس عالمِ فانی میں جنت کی خوشخبری اور وہ زبانِ نبوت سے یہ ایک نہایت سعادت مندی ہے، پس حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں عدمِ فضیلت کا قول کسی طرح درست نہیں۔'' (سیرتِ امیر معاویہؓ: ۱/۲۶۶، دارالکتاب، ۲۰۰۷ء)

حضرت مولانا محمد نافع صاحب قُدّس سرُّہٗ اسی طعن کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''اگر عدمِ صحت سے مراد یہ ہے کہ ان کی فضیلت میں کوئی حدیث ثابت نہیں تو یہ قول درست نہیں، کیونکہ متعدد روایات جو درجۂ حسن میں ہیں، وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی فضیلت میں موجود اور ثابت ہیں، اگرچہ ان کا استناد اصطلاحی صحت کے درجہ سے کم ہے، اور جو روایات درجۂ حسن میں ہوں

وہ محدثین کے نزدیک مقبول ہیں اور ان سے شرعی احکام ثابت ہوتے ہیں، یہ قاعدہ عند العلماء تسلیم شدہ ہے۔‘‘ (سیرتِ امیر معاویہؓ: ۲/ ۲۶۲)

صاحب النبراس علّامہ عبدالعزیز پڑہارویؒ (المتوفی: ۱۲۳۹ھ) اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

’’فأحد المطاعن فيه هو أن بعض المحدثين ومنهم المجد الشيرازي في سفر السعادة، قالوا: لم يصح في فضائله حديث. وكذا عنوان البخاري حديث ابن أبي مليكة. قوله: "ذكر معاوية" لا بالمناقب والفضل كما فعل في غيره. والجواب أنهٗ مر حديثان أحدهما من مسند أحمد والآخر من سنن الترمذي. فإن أريد بعدم الصحة عدم الثبوت فهو مردود لما مر بين المحدثين، فلا ضير، فإن فسحتها ضيقة، وعامة الأحكام والفضائل إنما تثبت بالأحاديث الحسان لعزة الصحاح. ولا ينحط ما في المسند والسنن عن درجة الحسن. وقد تقرر في فن الحديث جواز العمل بالحديث الضعيف في الفضائل، فضلا عن الحسن. وقد رأيت في بعض الكتب المعتبرة من كلام الإمام مجد الدين ابن الأثير صاحب ميزان الجامع: حديث مسند أحمد في فضيلة معاويةؓ صحيح، إلا أني لا أستحضر الكتاب في الوقت. ولم ينصف الشيخ عبد الحق الدهلوي في شرح سفر السعادة، فإنهٗ أقر كلام المصنف ولم يتعقبه كتعقبه على سائر تعصباته. وأما الجواب عما فعله البخاري، فإنهٗ تفنن في الكلام، فإنهٗ فعل كذا في أسامة بن زيد وعبدالله بن سلام وجبير بن مطعم بن عبد الله، فذكر لهم فضائل جليلة معنونة بالذكر.‘‘

(الناهية عن طعن أمير المؤمنين معاويةؓ،ص: ٦٧، ٦٨، ط: غراس، کویت)

یعنی’’حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر ایک اعتراض یہ بھی ہے جو بعض محدثین مثلاً مجد شیرازی نے سفر السعادہ میں کیا ہے، چنانچہ یہ کہا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے فضائل میں کوئی صحیح حدیث وارد نہیں ہے، نیز امام بخاریؒ نے بھی حدیث ابن ملیکہ پر بجائے’’المناقب‘‘اور’’الفضل‘‘کے’’ذکر معاویةؓ‘‘ کا عنوان قائم کیا ہے، (جس سے ان کی فضیلت کے وارد نہ ہونے کا شبہ ہوتا ہے) جواب اس کا یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی فضیلت میں دو احادیث گزر چکی ہیں: ایک مسند احمد کی اور دوسری سنن ترمذی کی۔ اگر عدمِ صحت سے مراد یہ ہے کہ ان کی فضیلت میں کوئی حدیث ثابت نہیں تو یہ قول درست نہیں، اور اگر صحت سے صحتِ مصطلحہ عند المحدثین مراد ہے تو کوئی حرج نہیں، کیونکہ اس کا دائرہ تنگ ہے۔

احادیثِ صحیحہ کی قلت کی وجہ سے بیشتر شرعی احکام اور فضائل حسن درجہ کی احادیث سے ثابت ہوتے ہیں، اور مسند اور سنن کی روایت درجۂ حسن سے کم نہیں ہے، نیز فنِ حدیث میں یہ بات ثابت ہے کہ فضائل میں تو حدیثِ ضعیف پر بھی عمل کیا جاتا ہے، چہ جائیکہ حدیثِ حسن، (حدیثِ ضعیف پر عمل کا یہ قاعدہ عام نہیں ہے، بلکہ اس میں تفصیلات ہیں جو کتبِ اصولِ حدیث میں موجود ہیں) جبکہ میں نے کسی معتبر کتاب میں صاحبِ میزان الجامع علّامہ مجد الدین بن الاثیرؒ کی یہ بات دیکھی ہے کہ فضیلتِ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ میں مسند کی روایت صحیح ہے، مگر اس وقت کتاب مستحضر نہیں، اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ''شرح سفر السعادۃ'' میں انصاف نہیں فرمایا، بلکہ مصنف کے کلام کو ثابت کردیا ہے اور اس پر گرفت نہیں کی، جیسا کہ وہ ان کے دیگر تمام تعصّبات پر گرفت فرماتے رہے ہیں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے طرزِ عمل کا جواب یہ ہے کہ وہ تفننِ کلام کے طور پر ہے کہ انہوں نے حضرت اسامہ بن زید، حضرت عبداللہ بن سلام، حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہم کے تذکرہ میں بھی یہی انداز اختیار کیا ہے، پھر ''ذکر'' ہی کے عنوان پر ان کے عظیم الشان فضائل لائے ہیں۔

یہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ بات جب پہلے بعض حضرات نے کہی اور لکھی ہے تو اگر ہم نے کہہ دی تو کون سی ایسی بات ہے؟ جواب بہت صاف اور سادہ ہے کہ وہاں طعن وتنقید کے پیرائے میں نہیں ہے، اس کے باوجود علماءِ اہل السنۃ نے قبول نہیں کیا، جبکہ یہاں تو ایک مستقل محاذ کھولا جارہا ہے اور بطورِ طعن وتشنیع یہ اعتراض اُچھالا جارہا ہے، نیز کسی بھی صحابیؓ کے نام کے ساتھ فضیلت کا وارد نہ ہونا اور بات ہے، جبکہ اس چیز کو بنیاد بناکر کسی صحابیؓ کو موضعِ طعن بنانا اور اس سے ان کی شخصیت پر جرح وقدح کرنا اور بات ہے، کیونکہ جماعتِ صحابہ کرامؓ میں بے شمار صحابہؓ ایسے ہیں کہ خاص ان کے بارے میں کوئی خاص فضیلت وارد نہیں ہوئی، مگر کیا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کی فی الجملہ فضیلت کا بھی انکار کردیا جائے؟ اور ان کے خلاف طعن وتشنیع اور تنقید کا بازار گرم کردیا جائے؟

علّامہ پڑہارویؒ فضیلتِ سیدنا معاویہؓ میں احادیث لانے سے پہلے بطورِ تمہید فرماتے ہیں:

''اعلم أن صحابته الكرام مائة ألف وأربعة عشر ألفا كالأنبياء، ومن ورد فيه أحاديث الفضائل أشخاص معدودة، وكفى بالصحبة فضلا للباقي، لترتب الفضائل العظيمة عليها مما نطق به الكتاب والسنة. فإن فقدت أحاديث الفضائل لبعضهم أو قلّت فلا إحجاف به.''

(الناهية عن طعن أمير المؤمنين معاويةؓ، ص:۳۸)

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرامؓ انبیاء کرام علیہم السلام کی طرح ایک لاکھ چودہ ہزار تھے

(تقریباً)، اور جن کے فضائل ومناقب میں احادیث وارد ہوئی ہیں، وہ گنتی کے حضرات ہیں، باقی حضرات کی فضیلت کے لیے صحبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کافی ہے، کیونکہ صحابیت کے بڑے فضائل ومحامد ہیں، جن پر قرآن وسنت ناطق اور گواہ ہیں، لہٰذا اگر کسی صحابیؓ کی فضیلت میں احادیث نہ ہوں یا کم ہوں تو کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔‘‘

مزید فرماتے ہیں:

’’وأقول قد صرح علماء الحديث بأن معاوية رضي الله عنه من كبار الصحابةؓ ونجبائهم ومجتهديهم ولو سلّم أنه من صغارهم فلاشك في أنهٗ دخل في عموم الأحاديث الصحيحة الواردة في تشريف الصحابة رضي الله عنهم، بل قد ورد فيه بخصوصهٖ أحاديث لقوله عليه الصلاة والسلام : ”اللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ هَادِيًا مَّهْدِيًّا وَاهْدِ بِهٖ“ رواه الترمذي و قوله عليه الصلاة والسلام اللّٰهُمَّ عَلِّمْ مُعَاوِيَةَ الْحِسَابَ و الْكِتَابَ وَ قِهِ الْعَذَابَ. رواه أحمد وماقيل: من أنه لم يثبت في فضلهٖ حديث فمحل نظر.‘‘ (النبراس، ص۳۳۰، امدادیہ، ملتان)

ترجمہ: ’’محدثین نے یہ تصریح فرمائی ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کبار، معزز اور مجتہد صحابہ کرامؓ میں سے ہیں اور اگر یہ بھی تسلیم کرلیا جائے کہ وہ صغار صحابہؓ میں سے ہیں تو اس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ فضیلتِ صحابہؓ میں وارد صحیح احادیث کے عموم میں داخل اور شامل ہیں، بلکہ خاص حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی فضیلت میں بھی احادیث موجود ہیں ....اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی فضیلت ثابت نہیں ہے، یہ بات محل نظر ہے۔‘‘

احادیثِ بالا وعباراتِ مذکورہ سے یہ بات ثابت ہوئی کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خصوصی فضیلت بھی احادیثِ صحیحہ اور احادیثِ حسان سے ثابت ہے۔

ثانیاً: اگر یہ بات تسلیم بھی کر لی جائے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی فضیلت میں کوئی صحیح حدیث نہیں ہے، بلکہ احادیثِ ضعیفہ ہیں تو محدثین کے ہاں یہ مسلّم ضابطہ ہے کہ حدیث ضعیف اگر کئی طرق سے مروی ہو تو وہ درجۂ ضعف سے نکل کر درجۂ حسن کو پہنچ جاتی ہے۔

علاوہ ازیں کیا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی فضیلت ومنقبت اور اعزاز کے لیے یہ بات ناکافی ہے کہ وہ صحابیِ رسول ہیں؟ اور صحابیِ رسول کے بالاتر از تنقید ہونے کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ اسے صحبتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) میسر ہے؟

اس بات کا اندازہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی اس روایت سے بخوبی کیا جاسکتا ہے کہ

جب حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے سامنے تعدادِ وتر کے مسئلہ میں سیدنا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی رائے اور موقف رکھا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد حضرت ابن عباسؓ جو خود اونچے درجے کے صحابی، مفسر اور عالم تھے، انہوں نے فرمایا کہ: ان کے بارے میں کچھ مت کہو، کیونکہ بلاشبہ و بالتحقیق وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں، اور دوسری روایت میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: انہوں نے درست کہا، لاریب وہ فقیہ مجتہد ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

''عَنِ ابْنِ اَبِيْ مُلَيْكَةَ، قَالَ: اَوْتَرَ مُعَاوِيَةُ بَعْدَ الْعِشَاءِ بِرَكْعَةٍ، وَعِنْدَهٗ مَوْلًى لِابْنِ عَبَّاسٍ، فَأَتَى ابْنَ عَبَّاسٍ فَقَالَ: دَعْهُ فَإِنَّهٗ قَدْ صَحِبَ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.'' (صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب ذکر معاویۃؓ، رقم: ۳۷۶۴)

''ابن ابی ملیکہ سے مروی ہے، کہتے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے عشاء کے بعد ایک رکعت وتر پڑھی، وہاں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے غلام بھی موجود تھے، انہوں نے آکر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو بتلایا تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ: انہیں کچھ مت کہو، بلاشبہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحبت یافتہ ہیں۔''

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحابیت اتنا عظیم شرف ہے کہ ان کے بارے میں رائے زنی کی مجال نہیں، چنانچہ علامہ عینیؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

''(دعه)، أي: اترك القول فيه والإنكار عليه، فإنهٗ صحب رسول الله صلى الله عليه وسلم وإنهٗ عارف بالفقه.'' (عمدۃ القاری، ج:۱۶، ص:۲۴۸، دار احیاء التراث العربی، بیروت)

ترجمہ: ''ان پر رائے زنی اور اعتراض نہ کرو کہ وہ صحابیِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور فقہ و اجتہاد کے عالم ہیں۔''

''عَنِ ابْنِ اَبِيْ مُلَيْكَةَ، قِيْلَ لِابْنِ عَبَّاسٍ: " هَلْ لَكَ فِيْ اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ مُعَاوِيَةَ، فَإِنَّهٗ مَا اَوْتَرَ إِلَّا بِوَاحِدَةٍ؟ قَالَ: اَصَابَ، إِنَّهٗ فَقِيْهٌ.''

(صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب ذکر معاویۃؓ، رقم: ۳۷۶۵)

''ابن ابی ملیکہ سے ہی مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے عرض کیا گیا کہ آپ امیر المؤمنین معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں کچھ فرمائیں گے کہ انہوں نے وتر ایک رکعت ہی پڑھی ہے؟ تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ: انہوں نے درست کیا ہے، بے شک وہ فقیہ ہیں۔''

حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت معاویہؓ پر فقہی نقد سے بھی منع فرما رہے ہیں، باوجودیکہ حضرت معاویہؓ کا یہ عمل باقی صحابہ کرامؓ کے عمل سے مختلف تھا، جیسا کہ ملا علی قاریؒ نے اس کی تصریح کی ہے:

''(فأتى ابن عباس فأخبرهٗ، فقال: دعه) ، أي اتركه ولا تعترض عليه بالإنكار (فإنهٗ قد صحب النبي صلى الله عليه وسلم)قال الطيبي، أي فلايفعل إلا ما رآه، يعني: ولعلهٗ رأى ما لم ير غيرهٗ وأصحابهٗ كالنجوم بأيهم اقتديتم اهتديتم، وهم عدول ولا يفعلون شيئا من تلقاء أنفسهم، لكن الحديث صريح في كون معاوية شاذا منفردا عن سائر الصحابةؓ.''

(مرقاۃ المفاتیح، ج:۳، ص:۹۵۴، رقم:۱۲۷۷)

''حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے غلام نے آکر جب انہیں یہ بتلایا (کہ حضرت معاویہؓ نے ایک رکعت وتر ادا فرمائی ہے) تو حضرت ابن عباسؓ نے ارشاد فرمایا کہ: انہیں کچھ مت کہو، یعنی انہیں چھوڑ دو اور ان پر اعتراض نہ کرو، کیونکہ انہیں شرفِ صحابیت حاصل ہے۔ علّامہ طیبیؒ (شارحِ مشکاۃ) فرماتے ہیں کہ: (مطلب یہ تھا کہ وہ صحابیؓ ہیں) لہٰذا وہی کریں گے جو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے دیکھا ہے، اس لیے ممکن ہے کہ انہوں نے کچھ ایسا دیکھا ہو جو کسی اور نے نہ دیکھا ہو اور اصحابِ رسولؓ ستاروں کی مانند ہیں، ان میں سے جس کا بھی اتباع کروگے راہ یاب ہوں گے، نیز وہ عادل ہیں، کچھ بھی اپنی طرف سے نہیں کرتے، لیکن یہ حدیث اس بات میں صریح ہے کہ حضرت معاویہؓ اپنے اس عمل میں باقی تمام صحابہ کرامؓ سے منفرد تھے۔''

اس حدیث مبارک سے دو امر مستفاد ہوئے: ❶ - حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی فضیلتِ صحبت، ❷ - اس فضیلتِ صحابیت کی وجہ سے تنقید سے بالاتر ہونا۔

مولانا محمد معاویہ سعدی (مظاہر علوم، سہارن پور) تحریر فرماتے ہیں:

''فضائل کا باب تو ایک اضافی چیز ہے، نہ معلوم کتنے صحابہؓ اور صحابیاتؓ، بناتِ طیباتؓ بلکہ بہت سے انبیاءِ کرام علیہم السلام کی ذواتِ قدسیہ ایسی ہیں کہ ان کے نام اور شخصیت کی تعیین کے ساتھ کوئی حدیث وارد نہیں ہوئی تو اس میں نقص کون سا ہے؟ کیا کسی ذات کی فضیلت کے لیے تنہا اس کا نبی یا صحابی ہونا کافی نہیں؟۔''

(حرمتِ صحابہ رضی اللہ عنہم، ص:۷۴، مکتبہ دار السعادۃ، سہارن پور، ۱۴۴۰ھ/ ۲۰۱۸ء)

علاوہ ازیں اقوالِ سلف صالحین سے بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی شخصیت ومقام آفتاب نیم روز کی طرح روشن اور عیاں ہے۔ مشہور مؤرخِ اسلام علّامہ ابنِ کثیرؒ نے لکھا ہے کہ محدثِ کبیر حضرت امام عبداللہ بن مبارکؒ سے پوچھا گیا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ افضل ہیں یا حضرت عمر ان عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ؟ تو انہوں نے فرمایا: کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت ورفاقت میں جہاد کرتے ہوئے جو مٹی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے گھوڑے کے ناک میں گئی، اس مٹی کے ذرے بھی حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے افضل ہیں۔

(البدایہ والنہایہ، جلد: ۸، صفحہ: ۱۳۹)

نیز یہ بھی آپ کی عظمت وشرافت کی دلیل ہے کہ آپؓ کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت ورشتہ داری بھی حاصل ہے، آپ کی ہمشیرہ ام المؤمنین سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حرمِ وزوجیت میں تھیں، یوں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے برادرِ نسبتی ٹھہرے، اور ایمان وعمل کے ساتھ قرابتِ رسول بھی بہت بڑا اشرف ہے۔

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم نے ایسے اعتراضات کی وجہ بیان فرمائی ہے:

''حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا سیاسی موقف چونکہ سیدنا حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے خلاف اور جمہور اہل السنۃ کے نزدیک حق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا، اس لیے ان کے مخالفین بالخصوص روافض کو ان کے خلاف پروپیگنڈے کا موقع مل گیا، اور ان کے خلاف الزامات واتہامات کا طومار لگا دیا گیا جس میں ان کے فضائل ومناقب چھپ کر رہ گئے، ورنہ وہ ایک جلیل القدر صحابیؓ، کاتبِ وحی اور ایسے اوصافِ حمیدہ کے مالک تھے کہ آج ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔'' (جہان دیدہ، ص: ۳۰۳)

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر کیا جانے والا یہ اعتراض خلافِ حقیقت ہے، اگر بالفرض صحیح روایات موجود نہ بھی ہوتیں تو شانِ صحابیت کے ہوتے ہوئے اس سے کوئی نقص پیدا نہیں ہوتا کہ جسے بنیاد بنا کر آپؓ پر بھونڈے اور رکیک مطاعن کا دروزاہ کھولا جائے۔

حقیقت اور صحیح بات یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے فضائل میں صحیح اور حسن درجہ کی روایات، نیز مؤیدات اور اقوالِ سلف موجود ہیں۔

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

استاذ العلماء حضرت مولانا محمد سواتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مولوی سعید احمد بن وزیر محمد
متعلم تخصصِ علومِ حدیث، جامعہ

حضرت الشیخ مولانا محمد سواتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ از ہر الہند دیوبند میں شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ، حضرت مولانا فخر الدین احمدؒ، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علیؒ کے علمی جواہر کے خوشہ چین، حضرت بنوریؒ کی محفلوں کے نقیب وراز دان، حضرت مفتی احمد الرحمٰنؒ کے قرین اور مشیر، اور جامعہ بنوری ٹاؤن کے ابتدائی اور مقبول اساتذہ میں سے بھی ہیں۔ علماء دیوبند کے علوم وافکار کے امین، اور زہد وقناعت کی ایک زندہ وجاوید مثال تھے۔ اس بطلِ جلیل کی زندگی، جواہراتِ علم وفضل کو چننے اور تشنگانِ علم تک لٹانے میں صرف ہوئی ہے۔ حضرت مولاناؒ خادمانِ دین وملت کی اُس عظیم لڑی کے گرانقدر موتی ہیں، جن کا شعار ایک ستارۂ درخشاں بن کر اپنے وجود کا احساس دلائے بغیر خاموشی سے تعمیر وترقی کا عظیم کام سرانجام دینا ہوتا ہے۔ آپ کی حیات اور خدمات کو شجرِ تاریخ سے پیوست کرنے کے لیے کوئی مضمون یا چند صفحات تو کیا، کئی سو صفحات بھی ناکافی ہیں، لیکن جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارکہ ’’اَلْبَرَكَةُ مَعَ اَكَابِرِكُمْ.‘‘[1] کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپ کی زندگی کے چند مخفی گوشوں کو ہدیۂ قارئین کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ جل جلالہ ہمارے لیے خیر وبرکت کا سامان بنائے اور اُن کے توسل سے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

نام ونسب، آبائی وطن

مولانا محمد بن مفتی عبد الکریم بن مفتی عبد الواحد رحمہم اللہ تعالیٰ۔ وادیِ سوات کے علاقے تحصیل خوازہ خیل، مقام چٹابٹ کے ایک علمی خاندان میں جس کا علم وکمال سے جدی پشتی ربط تھا، سنہ ۱۹۲۵ء میں پیدا ہوئے۔[2] مولانا کا تعلق پشتون قبیلہ کی قوم دولت خیل سے تھا، جو مضافاتِ مردان اور ضلع سوات میں آباد ہے، مولانا کے دادا مولانا عبد الواحد صاحبؒ بڑے متقی اور درویش صفت انسان تھے، اس کے

ساتھ ساتھ وہ ریاستِ سوات جو اُس زمانے میں ایک الگ ریاست تھی، کے منصبِ قضاء پر بھی فائز تھے، آپ کے والدؒ بھی ایک مستند مفتی تھے، مولاناؒ کے بڑے بھائی کا نام مفتی عبدالودود صاحبؒ تھا، انہوں نے بھی اپنے علاقے خوازہ خیل کے منصبِ قضاء کو ایک عرصہ تک زینت بخشی۔

ابتدائی تعلیم

بچپن ہی میں مولاناؒ کے سر سے شفقتِ پدری کا سایہ اُٹھ چکا تھا، حسبِ روایت دینی تعلیم کا آغاز اپنے گھر سے ہی کیا، مدتِ عمر گزرنے کے ساتھ بڑے بھائی کے ہمراہ تحصیلِ علم کے لیے مختلف جگہوں کے اسفار شروع کیے، اُس زمانے میں باقاعدہ طور پر دار العلوم کی شکل میں مدارس کا فیض عام نہ ہوا تھا سوائے چند مدارس کے، طلبۂ علم دور دراز علاقوں سے مشقتیں برداشت کرکے وہاں کے سکونت پذیر علماء کے درس میں شریک ہوتے تھے۔ دورانِ سفر مولاناؒ نے اپنے برادرِ محترم سے ابتدائی کتب پڑھنے کے ساتھ مختلف جگہوں کے علماء سے کسبِ فیض کیا۔ اُس وقت ابتدائی کتابیں مختلف مراحل میں پڑھ لیں، علمِ نحو کی مشہور کتاب ''کافیہ'' سمیت دیگر کتب زبانی حفظ کیں، پھر کچھ عرصے تک اپنے ماموں کی نگرانی میں اُن کے ساتھ طلبِ علمی کا سفر جاری رکھا، اس کے بعد ''کوش گرام'' کے علاقے میں ہندوستان کے ایک فاضل عالمِ دین سے مولانا نے علمِ صرف کے اسباق پڑھے، قابلیت کے جوہر شناس استاذ نے آپ کو باقاعدہ کسی مدرسے میں سلسلۂ علم کو جاری رکھنے کی ترغیب دی جو بار آور ثابت ہوئی۔

علمی سفر

آپ نے فنون کی ابتدائی کتب سے فارغ ہو کر اپنی علمی ترقی کے لیے کسی مدرسے میں مستقل قیام کا جب ارادہ کیا، تو اُس وقت دار العلوم دیوبند کو زیادہ موزوں سمجھا، چونکہ وہ دور دار العلوم کے عروج کا تھا، شیخ الاسلامؒ کا محدثانہ مقام اور شیخ الادب کے ادیبانہ زمزمے چہار دانگ عالم کو چار چاند لگائے ہوئے تھے، پہلے ہی سے سفرِ علم پر دور جانے کا شوق دل میں پیوست تھا، استاذ کی ترغیب نے شوق میں مزید اضافہ کیا، گھر آ کر اجازت چاہی، گھر والوں نے کم سنی کے سبب روکنے کی کوشش کی، لیکن اس نوعمر نوجوان کے دل میں پیوست علم کا شوقِ جنونی اور بے تاب کر دینے والا علمی جذبہ کیونکر اس کو رُکنے دیتا؟! روکنے والے تو ایک جذباتی شوق سمجھ کر آپ کے جانے سے بے پرواہ رہے، مگر عزمِ مصمم، جذبۂ ایمانی سے سرشار دل اور دل کو بے تاب کرنے والے شوق نے اس نوجوان کے ارادے کو کسی بھی طرح کمزور ہونے نہیں دیا، بالآخر یہ شوق میں مبتلا دل اپنی علمی پیاس بجھانے کے لیے اپنی منزلِ مطلوب کی جانب روبہ سفر ہوا۔

آپ کے اس سفرِ علم کی منظر کشی آپ کے ایک ہونہار شاگرد نے اُن ہی کی زبان سے کچھ یوں کی ہے کہ آپ کو جب شوق میں مبتلا دل نے کوچۂ جانان کی جانب روانہ کر کے مطمئن کر دیا، بن پوچھے، پہنے ہوئے کپڑے، جوتے، ٹوپی اور ایک اونیٰ چادر کو کل متاعِ سفر بنا کر والدہ کی آخری زیارت کر کے چل دیئے۔ یہ سفرِ ظفر کا وسیلہ یقیناً بنا، لیکن سفر کے لیے سوائے پیدل جانے کے کوئی وسیلہ نہ تھا، وسیلہ سواری ہی کو بنا لیتے اگر کچھ پیسے ہوتے، مجبوراً پیدل ہی ''خوازہ خیل'' آئے، یہی نیت لے کر کہ ایک جاننے والے دکاندار سے کچھ قرض لے لوں، تا کہ سفر کو جاری رکھا جا سکے، لیکن وہ خرید و فروخت میں ایسے مصروف کہ مولانا کی طرف توجہ ہی نہیں دی کہ بات ہو سکے۔

غیبی امداد

چاہیں تو اتفاق کہہ دیں یا اپنے مہمان کی لاج رکھنے کا نرالا خدائی انداز کہ مولانا اس دکاندار کی بے توجہی دیکھ کر پلٹنے کو تھے کہ اسی اثناء میں گاہک نے خرید کردہ سودے کے عوض ایک روپیہ دکاندار کو دینے کے بجائے ان کی طرف اُچھال دیا، جوں ہی اس نے سکہ پھینکا، دکاندار کے بجائے وہ مولانا کی چادر کی سلوٹوں کے دامن میں آ پہنچا، اسی لمحے مولانا بے خبری میں واپس جانے کو پلٹے، سکہ مولانا کا ساتھ دیئے جا رہا تھا، جبکہ دوسری طرف دکاندار اور گاہک زمین پر آنکھیں گاڑے سکہ تلاش کرنے میں محو تھے، اپنی فکر میں رواں دواں مولانا نے دور جا کر سینے پر بندھے ہاتھ چھوڑے تو مخصوص سکے کی کھنک نے متوجہ کیا، اس کا اندازہ تو بعد میں کہیں ہوا کہ یہ روپیہ کس آسمان سے گر کر غیبی امداد بننے کو چادر میں اَٹکا تھا۔ بقول استاذ محترم: ''اُس زمانے میں ایک روپیہ بھی بڑی حیثیت کا حامل تھا۔'' اسی کو متاعِ سفر بنا کر واقفانِ خاندان وقبیلہ سے نظر بچاتے پیدل چلتے رہے، دوپہر ڈھلے ''خوازہ خیل'' سے آگے ماموں کی معرفت کے بعض اصحاب کے ہمراہ جو پشاور جا رہے تھے، باصرار شاملِ سفر ہوئے، نوشہرہ پہنچے تو ایک مولوی صاحب نے نظر ملتے ہی گھر سے بن پوچھے نکلنے کا اندازہ کر لیا، روک کر ایک اور مولوی صاحب کو نظر رکھنے کی تاکید کے ساتھ حوالے کیا، لیکن وہ ان سے کیا کہتے کہ راہِ علم وعشق کے لیے یہ قدغنیں کہاں رکاوٹ بن سکتی ہیں؟! چپ چاپ اُٹھ کے پھر سفر جاری کیا، جس اسٹیشن پر اُترے تھے اس پر واپس آئے، گاڑی میں جگہ نہ ملنے پر پیدل ہی عازمِ سفر ہوئے، یہ انتظار بھی عبث سمجھا کہ اگلی گاڑی کے پہنچنے تک رات یوں ہی بسر کی جائے، پیدل نوشہرہ سے اٹک آ گئے، تو یہیں ایک طالب علم نما شخص ساتھ ہو لیا اور دیوبند جانے کا دعویٰ کیا، مولانا فرماتے ہیں: ''میں نے نظروں سے تول کر اس کو ہم عمر اور خود کو اس سے ذرا بھاری تصور کر کے ساتھ دینے کی حامی بھر لی، مگر کیا پتہ تھا کہ وہ میرے جوتے اور چادر کا چور نکلے گا۔'' خیر فیصلہ ہوا کہ اٹک کے قریب

اس کے گاؤں میں رات گزار کر اگلے دن پنڈی میں اس کے بھائی سے رخصت لے کر دیوبند جائیں گے۔

گاؤں پہنچے تو مولانا کو مسجد میں بٹھا کر (کھانا لانے کا دلاسہ دے کر) نکلا اور یوں غائب ہوا کہ رات ڈھلنے لگی اور اس شخص کا نام ونشان تک نہ تھا، مسجد میں اکیلے بیٹھے بیٹھے باہر جانے کا تقاضا ہوا تو دروازے پر آتے ہی دو آدمیوں کو یوں سرگوشی کرتے سنا کہ: جو اس مسجد میں رات گزارتا ہے ہم اس کے جوتے اور چادر چھین کر لے جاتے ہیں، اب تو باہر جانے کا خیال ہی نہ رہا، اور چار وناچار سردی کی پوری رات مسجد کے دروازے بند کر کے بھوک و پیاس سے بدحالی کے عالم میں گزارنی پڑی، صبح دیر سے وہ میزبان آئے اور تاخیر کا سبب بیماری کا عذر پیش کیا، قبول کرنا ہی پڑا۔ مولانا کی طبیعت میں شروع ہی سے ٹھہراؤ اور حلم کا مادہ ودیعت تھا۔ اس کا اندازہ بچپن میں اُن سے پڑھنے کے دوران اپنی شرارتوں اور اُن کی برداشت کو یاد کر کے اب بھی ہوتا ہے۔ فرمانے لگے: ''اب پیدل سفر شروع کیا، اٹک آئے اور پُل پار کیا اور پنڈی کی طرف روانہ ہوئے۔'' رات کی تاریکی نے جب ڈیرہ ڈالا، رات گزاری کے لیے مشورہ کیا تو واقفِ حال ہم سفر کی رائے تھی کہ کوئی مسجد میں رہنے نہیں دے گا، اس لیے لبِ راہ بچھی ریت کو جائے قیام بنا کر اُس پر ساتھی کی پُرانی اونی چادر بچھادی، جوتوں کو تکیہ تصور کر کے اور میری چادر میں دونوں لپٹ گئے۔

دورانِ سفر ایک المیہ

مولاناؒ فرماتے تھے کہ: سردیوں کی راتیں تھیں، پوری رات میری کمبل نما چادر پر ایک دوسرے سے کھینچا تانی رہی۔'' رات گزری توکل کے بھوکے مسافر پھر جانبِ منزل روانہ ہوئے اور چلتے چلتے پنڈی پہنچے۔ فرماتے تھے: ''پنڈی پہنچ کر وہ ساتھی عجیب مطالبہ کر بیٹھا کہ محترم! آپ ادھر ٹھہریئے، میں ذرا اپنے بھائی سے مل کر آتا ہوں! لیکن اپنے جوتے چادر مجھے دے دو، کیونکہ یہ نئے ہیں، اور میرے جوتے چادر پُرانے، نئے جوتے دیکھ کر بھائی خوش ہوجائیں گے۔ میں نے کہا: ''لو بھائی! جھوٹے کپڑے سے کیوں بھائی کو خوش کرنے لگے؟'' باوجودیکہ مولانا دل کے فیاض ہیں، اُس انکار کی وجہ اس ساتھی کے دل میں موجود چور کا ظاہر ہونا تھا۔ مولانا نے جو رات مسجد میں بسر کی، اس رات باہر سے چیزیں چھیننے کی باتیں بھی اسی ساتھی ہی کی زبان سے سنیں، اس لیے اپنے ہاتھوں سے اپنی متاع، چور کے ہاتھوں دینا کہاں کی عقل مندی ہوتی اور یہ چور کھل کر تب ظاہر ہوا جب مولانا نے انکار کے بعد نماز پڑھنی شروع کی تو سجدہ میں جاتے ہی مولانا کو جوتوں کی آہٹ سنائی دی، سجدہ سے سر اُٹھایا تو سامنے رکھے ہوئے مولانا کے جوتوں اور چادر کے بجائے اس ہمسفر کے پرانے گھسے جوتے اور بوسیدہ چادر بدقسمتی سے گریہ وماتم کرتی نظر آئی، اب سوائے کفِ افسوس ملنے کے اور

کچھ نہ تھا، بات سیدھے طریقے سے نہ بنی تو بظاہر ہمدرد بننے والے ساتھی نے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔

کم سِنی میں ہمت وحوصلہ کی ایک لاجواب مثال

آپ تصور کر سکتے ہیں کہ ایک چودہ سالہ نوجوان کی اس وقت کیا حالت ہوگی؟ جو تین دنوں کی پیدل مسافت طے کر کے کسی شہر میں، جہاں کوئی جاننے والا نہ ہو، بھوکا تھکا ماندہ بیٹھا ہو اور اس کی متاعِ سفر لٹ جائے، ایسی حالت میں تو اچھے خاصے عمر رسیدہ افراد بھی حوصلہ وہمت ہار بیٹھتے، لیکن ''وہ عشق بھی کیا عشق جسے کمزور کرے تکلیف''، نماز مکمل کر کے چور کے چھوڑے ہوئے جوتے اور چادر اُٹھائے پنڈی اسٹیشن جا پہنچے۔

خدا کی شان کہ اسٹیشن ہی پر اجمیر شریف (ہندوستان) جانے والے چند ہم علاقہ مسافروں سے ملاقات ہوئی، مدعا بیان کیا تو وہ ساتھ لے جانے پر رضامند ہوئے، مولانا فرماتے ہیں: ''میں نے سفر شروع کیا تو سب سیٹوں کے نیچے آرام کرنے اُتر گئے، چلتے چلتے سہارن پور آ گیا، سہارن پور میں گاڑی رک گئی تو ڈبے میں سوار ایک شخص نے چیخنا چلانا شروع کیا کہ یہ بچہ حکومت کا نقصان کر رہا ہے، وہ یہ سمجھا کہ شاید قریب کسی جگہ سے بغیر ٹکٹ لیے سوار ہوا ہے، لیکن ایک ہندو نے اس کو روک کر مولانا کو بلایا، احوال معلوم کیے، جب بھوک کا پتہ چلا تو دو تین آنے دے کر کچھ کھانے کو منگوایا، مولانا فرماتے ہیں: ''میں ڈبے سے اُترا اور کچھ چیزیں خرید کر کھلے لفافے میں ہتھیلی پر رکھ کر ٹرین کے ڈبے کی طرف آنے لگا کہ ناگاہ ایک چیل نے جھپٹا مارا، اور کچھ گرا کے کچھ اُڑا کے یہ جا وہ جا ہوئی۔'' میں خالی ہاتھ ہندو محسن کے پاس آ کر بیتی کہانی دہرانے لگا تو اس نے دوبارہ پیسے دے کر احتیاط سے لے کر آنے کی ہدایت کی۔ مولانا دوبارہ جا کر وہاں سے کھانا لے کر واپس آ گئے اور منزلِ مقصود کی جانب راہیِ سفر ہوئے۔

دارالعلوم دیوبند تک کا سفر

اب جب ہندو کو معلوم ہوا کہ دیوبند جا کر پڑھنے کا ارادہ ہے تو سہارن پور ہی میں یہ کہہ کر رہنے کا مشورہ دیا کہ: ''یہاں ایک بڑا مدرسہ ہے، بہت سے مولوی آتے ہیں۔'' مولانا نے بھی اس کی بات پر عمل کیا، فرمایا کہ: ''جس وقت میں گھر سے چلا تھا اس وقت مدارسِ دینیہ کے اسباق شروع ہوئے کافی دن گزر چکے تھے، اس لیے سہارن پور کے اس مدرسے میں داخلہ نہ ملا۔'' مظفر نگر پہنچے اور ایک مسجد مدرسہ میں امتحان دے کر داخلہ لے لیا، لیکن دل نہیں لگا، دو تین دن بعد دیوبند کا سفر کیا، دیوبند آ کر سرحد کے طلبہ اور دوسرے علاقے کے طلبہ سے ملاقات ہوئی، انہوں نے داخلے کی بندش کی دردناک اطلاع دی، مجبوراً میرٹھ جا کر مدرسہ امداد الاسلام میں داخلے کے لیے آئے، فرماتے تھے کہ: ایک استاذ نے امتحان لیتے ہوئے

''کنز الدقائق'' کا سوال پوچھا کہ ''النکاح سنة مؤکدة وعند التوقان واجب'' میں مذکور ''توقان'' کس امام کا نام ہے؟ فرماتے تھے کہ: ''میں نے فارسی میں جواب دیا کہ ''توقان غلبۂ شہوت رامی گویند و نام امامے نیست'' (یعنی توقان غلبۂ شہوت کو کہا جاتا ہے، کسی امام کا نام نہیں) فارسی میں جواب سن کر استاذ نے یہ کہہ کر مدرسہ میں رہائشی داخلہ دینے سے انکار کیا کہ اُردو زبان نہیں جانتے، مجبوراً ایک پشتو زبان بولنے والے ساتھی کے ساتھ باہر رہائش اختیار کر کے دو سال اسی مدرسے میں پڑھا، اور ان دو سالوں میں بھی عجیب وغریب حالات کا سامنا ہوا، مختلف کتابیں پڑھ کر دو سال میں درجہ مکمل کر کے اس کے بعد مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کی طرف روبہ سفر ہوئے، وہاں مولانا نے سخت امتحان دے کر داخلہ لیا اور دو سال گزارے، الغرض بہت نامساعد حالات سے گزرنا پڑا، مختلف مصائب اور مشقتوں کو سہنا پڑا۔

دار العلوم دیو بند میں داخلہ

یوں تو مظاہر علوم سہارنپور بھی ایک بہت بڑا علمی مرکز تھا، اور دار العلوم دیو بند کے بعد ہندوستان کا دوسرا بڑا مدرسہ سمجھا جاتا تھا، لیکن جس شوق نے مولانا کو گھر بار چھوڑنے پر مجبور کیا تھا، جس عشق نے اُن کو اپنوں کی شفقت بھری نگاہوں سے دور رہنے پر اُبھارا، والدہ جیسی عظیم نعمت (جس کے متعلق مولانا کے بڑے بیٹے نے ہمیں بتایا کہ: مولانا کے جانے کے بعد وہ اس قدر روتی تھی کہ بالآخر آنکھوں کی بینائی ہی چلی گئی) کو چھوڑنے پر مجبور کیا، اُس مطلوب تک پہنچنے میں ابھی بھی کچھ مراحل باقی تھے۔ ویسے دنیا کا ایک قانون ہے کہ کسی چیز کا شوق وضبطِ شوق جب دل پر غالب آتا ہے تو پھر اس کے حصول کے لیے جتنی بھی مشکلات راستے میں آتی ہیں، اُن سے بھی انسان محظوظ ہوتا ہے، پھر جب طلب بھی صادق ہو اور ارادے بھی نیک ہوں، مزید یہ کہ صبر وتوکل کا توشہ بھی ہمراہ ہو، پھر کیونکر راستے میں آنے والی مشکلات اور مصائب منزلِ مقصود کے راہی ومسافر کو روک سکیں، شاعرِ مشرق اقبال مرحوم فرماتے ہیں:

ارادے جن کے پختہ ہوں نظر جن کی خدا پر ہو
تلاطم خیز موجوں سے وہ گھبرایا نہیں کرتے

بہر حال مظاہر علوم سہارنپور میں دو سال گزارنے کے بعد کچھ ساتھیوں سے مل کر، جس سفر کا ارادہ کر کے گھر سے نکلے تھے، اسی پر پھر روانہ ہو کر دیو بند آ گئے۔ داخلۂ امتحان حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لیا اور بتاریخ ۱۶ رشوال المکرم ۱۳۶۱ھ کو باقاعدہ طور پر آپ کا داخلہ ہو گیا(۳)، تو یوں لگا جیسے تھکے ماندے مسافر کو آبِ شیریں مل جائے، جس کے لیے برسوں کی محنت کی تھی، وہاں داخلہ مل گیا، تو اب وہیں کے ہو گئے۔ مولانا نے ۵ سال فنون کی کتب مختلف علماء سے پڑھ کر چھٹے سال دورہ حدیث

میں حضرت مدنیؒ اور مولانا فخر الدین احمد صاحبؒ سے یکے بعد دیگرے بخاری شریف وترمذی شریف اور مولانا اعزاز علی صاحبؒ سے ابوداؤد شریف پڑھنے کا شرف حاصل کیا، اگلے سال طب پڑھ کر باقاعدہ طور پر دار العلوم دیوبند سے سندِ فراغت حاصل کی۔

آپ نے دار العلوم دیوبند میں مختلف کتابیں پڑھی ہیں، مثلاً: تفسیر واصولِ تفسیر میں سے تفسیرِ جلالین اور الفوز الکبیر۔ علم حدیث واصولِ حدیث میں سے صحاحِ ستہ، شمائل، موطأین، شرح معانی الآثار، مشکاۃ المصابیح، شرح نخبۃ الفکر۔ فقہ واصولِ فقہ میں سے ہدایہ اخیرین، التوضیح والتلویح۔ علم العقائد والکلام میں سے شرح العقائد، وحاشیہ خیالی۔ اور علم ادب میں سے المقامات للحریری، ودیوان المتنبی۔ اور اس کے علاوہ دیگر علوم مثلاً: علم المعقول والفلسفہ، علم الہیئۃ اور علم الہندسۃ کی بھی مختلف کتب پڑھنے کا شرف حاصل کیا ہے۔

مشہور اساتذہ

آپ نے ابتدائی کتابیں اپنے بڑے بھائی مفتی عبدالودود صاحب سے پڑھیں، پھر اس کے بعد فنون کی ابتدائی کتابوں کے لیے اپنے علاقے کے مختلف علمائے کرام کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا، جیسا کہ ہم نے شروع میں ذکر کیا، پھر چودہ سال کی عمر میں ہندوستان کا سفر کیا، وہاں جا کر میرٹھ میں امداد الاسلام میں دوسال گزارے، پھر مظاہر علوم سہارنپور آئے، یہاں بھی دوسال گزارے اور ابتدائی درجات کی تعلیم حاصل کی، یہ غالباً ۱۳۵۹ھ کے قریب کا زمانہ ہے، پھر اس کے بعد عالمِ اسلام کی مشہور دینی درسگاہ دار العلوم دیوبند تشریف لائے اور یہاں اکابرینِ اُمت سے ۶ سال خوب استفادہ کیا، جن میں سے چند مشہور علمائے کرام کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

۱- شیخ العرب والعجم، جانشینِ شیخ الہند، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

۲- شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا محمد اعزاز علی امروہی رحمۃ اللہ علیہ

۳- حضرت مولانا بشیر احمد خان صاحب بلند شہری رحمۃ اللہ علیہ

۴- حضرت مولانا اصغر حسین دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ

۵- حضرت مولانا عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ (اکوڑہ خٹک)

پاکستان آمد

آپؒ نے ۱۳۷۰ھ کو عالمِ اسلام کی مشہور دینی درسگاہ دار العلوم دیوبند سے سندِ تکمیل کے حصول کے بعد (اس وقت پاکستان کو آزاد ہوئے دوسال ہو چکے تھے) احمد آباد آ گئے اور یہیں پر کچھ عرصہ منصبِ امامت پر

فائز ہوئے، لیکن شاید تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا، انہوں نے خود کو ہندوستان کے بجائے سرزمینِ پاکستان میں رہنے کے لیے موزوں سمجھا، اور اس کو ایک اتفاق سے تعبیر کرنا شاید بے جا نہ ہوگا کہ گھر جانے کے بجائے کراچی میں آکر جامعہ بنوری ٹاؤن کے قریب لالوکھیت (حالیہ لیاقت آباد) میں ایک مسجد میں امامت کی ذمہ داری سنبھالی، آپ اس وقت ناظم آباد نمبر: ۳، جامع مسجد قدسیہ کے متصل ایک مکان میں رہائش پذیر تھے، کچھ عرصے تک یہی مشغلہ رہا، پھر اس کے بعد آپ نے ۱۹۷۸ء میں جامع مسجد محمدی جمشید روڈ کے منصبِ امامت وخطابت کو تادمِ حیات زینت بخشی اور اپنا گھر بھی یہاں منتقل کر کے سکونت اختیار فرمائی۔ آپؒ زندگی کے آخری لمحات تک اسی امامت اور مسجد کے ساتھ منسلک رہے اور یہیں سے بقضائے الٰہی دارِ بقاء کے حقیقی سفر پر روانہ ہوئے۔

تدریسی خدمات

آپ نے کراچی تشریف لا کر لالوکھیت میں جب ایک مسجد کی امامت سنبھالی، تو ان دنوں حضرت بنوریؒ کراچی آئے ہوئے تھے اور نیوٹاؤن (حالیہ بنوری ٹاؤن) کے علاقے میں مدرسہ کا سنگِ بنیاد رکھا (المدرسة العربية الإسلامية) جو اللہ کے فضل وکرم اور حضرت بنوریؒ کی دعاؤں اور مخلصانہ کوششوں کا ثمرہ ہے کہ آج پوری دنیا میں مرکزِ علم وعرفاں جامعۃ العلوم الاسلامیہ کے نام سے مشہور ہے۔

اسی دوران والدہ کی رحلت کا سانحہ پیش آیا، مولانا اس مسجد میں زیادہ عرصہ نہ ٹھہر سکے، چنانچہ مولانا بنوریؒ کے پاس آکر مدرسہ میں اعزازی تدریس کی اجازت طلب کی، جامعہ بنوری ٹاؤن کا یہ طرۂ امتیاز ہے کہ یہاں ابتدائی درجات کے بجائے منتہی درجاتِ تکمیل، دورہ حدیث وغیرہ سے پڑھائی کا آغاز ہوا۔ حضرت بنوریؒ نے اس وقت آغاز کردہ تکمیل میں حصہ لینے کا مشورہ دیا اور پھر دیگر درجات شروع ہونے پر تدریس کے لیے نامزد کیا، انہوں نے یک سالہ تکمیل کے دوران حضرت بنوریؒ سے حجة الله البالغة وغیرہ پڑھ لی، اس کے بعد دیگر درجات میں جو اسی وقت شروع کیے گئے تھے، تدریس شروع کی اور تادمِ حیات جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی میں اپنے علمی فن وہنر کے جوہر دکھاتے رہے اور تشنگانِ علم اُن سے اپنی علمی پیاس بُجھاتے رہے۔

خواب میں حضرت مدنیؒ کی زیارت

فرماتے تھے کہ: تدریس سے قبل میں نے حضرت مدنیؒ کو خواب میں دیکھا کہ ایک میدان ہے جس میں چھوٹے چھوٹے درخت ہیں، سامنے قلعہ ہے جس کی دیواروں پر بھوسہ سا لٹکا ہوا ہے۔ مولانا مدنیؒ کو میں نے دیکھا کہ اس میدان میں بیٹھے مجھے فرما رہے ہیں کہ: سواتی! اس پر چڑھ جاؤ اور پکا پکایا کھاؤ۔ میں نے کہا: کیسے چڑھوں حضرت؟ فرمایا: چڑھ جا! میں نے چڑھنے کی کوشش کی اور قلعہ کی دیوار پر بیٹھ کر اندر دیکھا تو قلعہ میں

علماء وطلباء سے لق ودق بھری آبادی نظر آئی، میں نے اُترنے کی کوشش کی، لیکن پاؤں زمین سے قریب ہونے کے بجائے اوپر اُٹھتے گئے، اسی کشمکش میں نیند سے اُٹھا، جب حضرت بنوریؒ سے خواب کا ذکر کیا تو کچھ دنوں بعد فرمایا کہ: تمہیں مدرسہ میں اعزازی مدرس رکھ لیا گیا۔ اس زمانے میں مولانا مفتی ولی حسن صاحب، اور مولانا لطف اللہ پشاوری صاحب وغیرہ بھی تدریسی خدمات سرانجام دے رہے تھے اور یوں آہستہ آہستہ یہ سلسلہ چل پڑا۔ اُس زمانے سے تادمِ حیات حضرتؒ جامعہ بنوری ٹاؤن میں تدریس سے منسلک رہے۔

آپؒ کے تلامذہ

آپؒ جامعہ میں ایک سال تکمیل کرنے کے بعد منصبِ تدریس پر فائز ہوئے اور ساری زندگی تدریس سے منسلک رہے، علوم وفنون کی شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہو جو مدرسہ میں رائج ہو اور آپ کے زیرِ تدریس نہ رہی ہو تو اس طریقے سے تمام درجات کے طلبہ کو اللہ نے اُن سے مستفید ہونے کا موقع عنایت فرمایا، تو آپ کے شاگردوں کی تعداد سینکڑوں نہیں، بلکہ ہزاروں سے بھی متجاوز ہے، ان میں سے مندرجہ ذیل شخصیات کے نام مشتِ نمونہ از خروارے کے طور پر پیشِ خدمت ہیں:

جامعہ بنوری ٹاؤن کے حالیہ اساتذۂ حدیث میں سے اکثر اساتذہ آپ کے تلامذہ میں سے ہیں، جیسے حضرت مولانا قاری مفتاح اللہ صاحب، حضرت مولانا محمد زیب صاحب، جامعہ کے ناظمِ تعلیمات حضرت مولانا امداد اللہ صاحب اور رئیس الجامعہ حضرت مولانا سید سلیمان یوسف بنوری صاحب دامت برکاتہم۔

وفات

مولاناؒ نے اپنی زندگی میں مختلف قسم کی تکالیف اور مشقتیں برداشت کیں اور طرح طرح کے مصائب کا سامنا بھی کرنا پڑا، لیکن ان کا اثر مولانا کے جسم پر کبھی بھی نہ کسی بیماری کی صورت میں ظاہر ہوا، نہ کسی پریشانی کی صورت میں، آپ کو ایک عرصہ سے بلڈ پریشر کی بیماری اگرچہ لاحق تھی، لیکن وہ بھی حدِ اعتدال سے متجاوز نہ تھی، مگر جب آپ کا ایک بیٹا کراچی ہی میں علماء کی ٹارگٹ کلنگ کی زد میں شہید کر دیا گیا تو اس کے فراق کے اثر نے مولانا کے دل کو زخمی کیا، ایک طرف ضعیف العمری کا عالم تو دوسری جانب پدرانہ شفقت کے سبب جوان بیٹے کے سانحۂ ارتحال کا غم تھا، اسی زخم کا اثر تھا کہ بلڈ پریشر بھی حدِ اعتدال سے بڑھ گیا اور مختصر عرصۂ علالت کے بعد یہ علم وعمل کا خزانہ، عجز وسادگی کا ایک گوہرِ نایاب، صبر وقناعت کی ایک مجسم تصویر، نمونۂ اکابرِ دیوبند، ۲۳ رمضان المبارک ۱۴۲۹ھ مطابق ۲۴ ستمبر ۲۰۰۸ء کو راہیِ سفرِ آخرت ہوا، إنا لله و إنا إليه راجعون. (۴)

حواشی وحوالہ جات

۱- صحيح ابن حبان بترتيب ابن بلبان محمد بن حبان البُستي (المتوفى:٣٥٤هـ) ت: شعيب الأرنؤوط، ط: مؤسسة الرسالة ، بيروت (ج:٢، ص:٣١٩)

۲-مولاناؒ نے انٹرویو میں اپنی عمر ۷۵ سال بتائی ہے، اور یہ انٹرویو ۱۴۲۱ھ کا ہے، اس اعتبار سے اگر حساب لگایا جائے تو تاریخِ پیدائش ۱۹۲۵ء بنتی ہے، اس کے برخلاف مولانا کے شناختی کارڈ میں تاریخِ پیدائش ۱۹۱۹ء درج ہے، ان دونوں میں سے تاریخِ اول (۱۹۲۵ء) زیادہ صحیح اور راجح ہے، کیونکہ اگر تاریخِ ثانی (۱۹۱۹ء) کو لیا جائے تو اس صورت میں بقیہ اسناد کی تاریخوں کے ساتھ اس کا ربط نہیں آتا، اس لیے ہم نے تاریخِ اول کو ترجیح دے کر اسی کو ذکر کیا ہے۔

۳-یہ تاریخ آپؒ کی دارالعلوم دیوبند کی سندِ فراغت سے لی ہے۔

۴-مولاناؒ کے حوالے سے کچھ احوال آپ کے بڑے بیٹے نے ہمیں بتائے ہیں، اور بعض احوال آپ کے اس انٹرویو سے لیے گئے ہیں جو جامعہ کے بعض طلبہ نے آپ سے ان کی مسجد میں لیا تھا اور وہ بینات کے ایک خاص شمارہ (النجوم اللامعة في تراجم أساتذة الحديث و فُضلاء الجامعة سنة ١٤٢١هـ) میں چھپ چکا ہے، تاریخیں، اساتذہ کے نام وغیرہ چند معلومات آپؒ کی اسناد اور دستاویزات سے لی گئی ہیں۔

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

ہیومن اِزم اور ہیومن رائٹس

مولانا محمد احمد حافظ

مدیر ماہنامہ وفاق

ملحدانہ افکار کا ایک طائرانہ مطالعہ

(قسط:۱)

پاکستان اس وقت بھیانک معاشرتی اور نظاماتی تبدیلیوں کے دوراہے پر کھڑا ہے، فکر و نظر میں تبدیلی کی کوشش کی جارہی ہے، اسلامی اقدار اور روایات کو مسمار کرنے کی مذموم مہم چلائی جارہی ہے، نوجوانوں کو دین سے برگشتہ اور اِلحادی نظریات سے متاثر ہونے کا ماحول دیا جارہا ہے، ریاستی سطح پر ایسے قوانین رائج کیے جارہے ہیں جو ہمارے معاشرے کی ساخت کو تبدیل کررہے ہیں۔ ’’ٹرانس جینڈر ایکٹ‘‘ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

تبدیلی کا یہ عمل عین سترہویں صدی کے یورپ سے مماثلت رکھتا ہے، جب وہاں اِلحادی نظریات کا منہ زور سیلاب آیا ہوا تھا اور یورپی معاشرہ مادر پدر آزاد تہذیب کے سیلاب میں بہے جارہا تھا۔

اس تحریر میں یہ بات جاننے کی کوشش کی گئی ہے کہ یورپ کا عیسائی معاشرہ اور خود عیسائیت ملحدانہ نظریات کا شکار ہوکر کیوں تباہ ہوئی؟ آج مغربی معاشرے کی جو ساخت ہے، اس کے پس منظر میں کیا فکر و فلسفہ کارفرما ہے؟ اور کس طرح یہ جاہلیتِ جدیدہ عالمِ اسلام کو متاثر اور مسلم معاشروں کی تخریب کررہی ہے؟!

آج ہمارا مقابلہ عیسائیت اور یہودیت سے من حیث المذہب نہیں، اس لیے کہ یہ مذاہب اپنی اصل کے اعتبار سے نابود ہوچکے ہیں، ان مذاہب کی چند علامتی رسوم باقی رہ گئی ہیں۔ آج ہمارا اصل مقابلہ مغربی فکر اور تہذیب سے ہے۔

سیکولر اِزم اور لبرل اِزم کے مباحث جو پہلے بند کمروں میں، اعلیٰ تعلیمی اداروں کی کلاسوں میں یا ادبی تقریبات میں ہوتے تھے، ذرائع ابلاغ کی عمومیت سے معاشرے میں عام ہو گئے ہیں۔ سوشل میڈیا کے ذریعے مغربی آدرشوں کو تیزی سے پروان چڑھایا جارہا ہے۔ اب نہ صرف کھلے عام یہ کہنا کہ ''میرا کوئی مذہب نہیں'' آسان ہوگیا ہے، بلکہ مذہب کا مضحکہ اُڑانا اور مقدس شخصیات کی توہین کرنا بھی ایک فیشن بن گیا ہے۔ اخلاقی اور معاشرتی اقدار کے وہ تمام تانے بانے جو دین وشریعت سے ماخوذ ومستفاد تھے، ایک ایک کرکے ٹوٹتے چلے جارہے ہیں۔ ''ہیومن رائٹس'' پر توسب متفق نظر آتے ہیں، اور انہیں جدید زندگی کا لازمہ تصور کیا جارہا ہے۔ آج کا دین دار طبقہ ان مباحث کی مبادیات سے ناواقف ہونے کی بنا پر اس کا ایسا رد پیش نہیں کرپارہا جو اُنہیں بیخ وبن سے اُکھاڑ پھینکے۔ مغرب پر تنقید ہوتی ہے تو اس کے چند ظواہر پر، مثلاً وہاں فحاشی عریانی ہے، خاندان بکھر گئے ہیں، فرد تنہا ہوگیا ہے، وغیرہ......لیکن یہ سب کیسے ہوا؟ کیوں ہوا؟ ان سوالات کا جواب اُن کے پاس نہیں۔

معاشرے میں تبدیلی کیسے واقع ہوتی ہے؟

کسی بھی اقداری اور معاشرتی تبدیلی سے قبل انسان کے عقائد وافکار اور خیالات میں تبدیلی آتی ہے۔ عقائد اور نظریات کے اثرات لازماً انسان کے قول وفعل پر رونما ہوتے ہیں۔ اسی تناظر میں دیکھنا چاہیے کہ انسان کا عقیدہ جس قدر راست، پاکیزہ اور وحیِ الٰہی کے مطابق ہوگا، اسی قدر انسان کی شخصیت میں، اس کے کردار وافعال میں پاکیزگی ہوگی؛ اور انسان سے ایسے افعال واعمال کا صدور ہوگا جو معاشرے میں امن وسلامتی اور صلاح وفلاح کو عام کریں گے۔ انسان کے عقائد ونظریات جس قدر وحیِ الٰہی سے دور ہوں گے؛ اسی قدر اس کے افعال واقوال اور کردار میں بگاڑ، پستی اور پراگندگی بڑھتی جائے گی۔ اس کی ذات سے ایسے اعمال کا صدور ہوگا جو زمین کو فساد سے بھر دیں گے۔

یورپی معاشرے میں تبدیلی کیسے واقع ہوئی؟

یورپ میں آنے والی اعتقادی اور فکری تبدیلیوں کے آغاز کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ یورپ کا عیسائی معاشرہ اپنے لایعنی اور باطل عقائد کے سبب ذہنی فکری کشمکش کا شکار ہو چکا تھا۔ اس کشمکش کا سبب عیسائی پادری تھے، جنھوں نے عیسائی تعلیمات پر اپنی خواہشات کا لبادہ اوڑھایا۔

عیسائیوں نے دو اَدیان کو ملا کر ایک دین بنایا تھا: ایک انبیاء موحدین کا دین اور ایک مشرکین کا دین، یعنی ان کے دین میں ایک حصہ تو انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات کا تھا اور ایک حصہ اُن اقوال وافعال کا

تھا جو انہوں نے مشرکوں کے دین سے لے کر شامل کیے تھے۔ اسی طرح انہوں نے ''اقانیم'' کے الفاظ ایجاد کیے، جن کا انبیاء کرام علیہم السلام کے کلام میں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا تین اقانیم کا مجموعہ ہے، یہ تینوں الگ الگ ہیں، مگر ایک دوسرے سے جدا بھی نہیں۔ باپ (اللہ) خدا ہے، بیٹا (عیسیٰ علیہ السلام) خدا ہے، اور روح القدس (جبریل علیہ السلام) بھی خدا ہے، مگر یہ تین نہیں، ایک خدا ہے۔ اسے عقیدۂ تثلیث بھی کہتے ہیں۔

اسی طرح اُنہوں نے مجسم اور سایہ دار بتوں کی جگہ وہ بت ایجاد کیے جن کا سایہ نہیں ہوتا۔ آفتاب اور چاند کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے، موسم بہار میں روزہ رکھنے کو دین میں شامل کیا، تاکہ بزعمِ خویش دینِ شرعی اور اَمرِ طبعی دونوں کو وہ جمع کر لیں۔

عیسائی اعتقادات کے مطابق چوں کہ حضرت آدم (علیہ السلام) نے گناہ کیا تھا اور اسی کی بدولت جنت بدر ہوئے تھے، لہٰذا ہر انسان کو آدم علیہ السلام کا گناہ وراثت میں ملتا ہے، اس لیے اللہ نے اپنے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام کو جو خود (عیسائیوں کے نزدیک) خدا بھی تھے، دنیا میں بھیجا اور اُنہوں نے صلیب پر جان دے کر سارے انسانوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا، چنانچہ جو کوئی بھی عیسائیت قبول کرے گا' نجات پائے گا۔ عیسائیوں کا عقیدۂ تثلیث یعنی باپ (خدا) بیٹا (عیسیٰ) اور روحِ قدس، یہ تینوں خدائی میں برابر کے شریک ہیں۔ عیسائیوں کا یہ عقیدہ بھی یونانی مذہب کے اس تصور سے مستعار ہے کہ ''دیوتا'' انسانی جسم میں حلول کر سکتا ہے۔ عیسائیت پر ارسطوی فکر بھی غالب رہی، ایک وقت تک عیسائیت اپنے اعتقادات کو نص کی بجائے ارسطو کی منطق سے ثابت کرنے کی کوشش کرتی رہی، لیکن جب ارسطو کی فکر پر نقد ہوا اور وہ لغو ثابت ہوئی تو گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی سے عیسائی عقائد کی معقولیت کو خود پادریوں نے چیلنج کرنا شروع کر دیا، بالخصوص نظریۂ تثلیث ہدفِ تنقید بنایا گیا۔

اس طرح عیسائیت کے داخلی اعتقادی انتشار نے یورپ میں لادینی تہذیب کے ارتقاء میں اہم کردار ادا کیا، ظاہر ہے کہ اس ملغوبہ قسم کے مذہب کو قبول کرنا انسانیت کے لیے آسان نہیں تھا، پھر جب ان محیر العقول اعتقادات کے ساتھ ریاستی جبر اور تشدد بھی شامل ہو جائے تو مذہب سے بغاوت ناممکن نہیں رہتی، یہی کچھ یورپ میں عیسائیت کے ساتھ ہوا، اور کیتھولک عیسائیوں کے مقابل پروٹسٹنٹ کھڑے ہوئے۔

عیسائی معاشرے میں اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کے انسانی جسم میں حلول کرنے کا عقیدہ ''انسان پرستی'' (Humanism) کی بنیاد بنا۔

ہیومن ازم کا دعویٰ ہے کہ انسان خدا کی صفات اپنا کر خدائی اختیارات حاصل کر سکتا ہے۔ خدا کوئی ماورائے کائنات ہستی نہیں، بلکہ محض چند ایسی صفات کا مجموعہ ہے جو انسان اور کائنات کے دیگر اجسام پر حلول کر سکتا ہے، ایسا محض عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ کسی بھی انسان کے وجود میں حلول کر سکتا ہے۔

جب یہ بات تسلیم کرلی جائے تو پھر انسان کا یہ اختیار کہ خیر وشر کے معیارات اور زندگی گزارنے کے طریقے خود مدوّن اور مروّج کرے، آسان ہوجاتا ہے۔ یورپ میں اس فکر کے پروان چڑھنے کا دورانیہ پندرہویں صدی عیسوی کا ہے۔ اس فکر نے آگے چل کر عیسائیت پر کاری ضرب لگانے کا موقع فراہم کیا (چوں کہ عیسائیت اس وقت ہمارا موضوع نہیں، اس لیے مزید تفصیلات سے احتراز مناسب ہے)۔

ریشنل ازم (عقلیت) کا دور

اسی دورانیے میں یورپی مفکرین نے عیسائیت کو ریشنل (Rational) بنیادوں پر پرکھنے کی بِنا ڈالی، کہا گیا کہ:

''مذہبی تعلیمات کو پرکھنے کی کسوٹی Reason ہے، اور اس کی تعبیر عقلی بنیادوں پر کیے بغیر بدلے ہوئے زمانوں میں انسانوں کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوسکتیں۔''

یہ ملاحدہ قدیم کا صدیوں سے چلا آنے والا سکہ بند جملہ ہے۔

''ڈیکارٹ'' (Rene Descartes) جو جدیدیت کا بانی اور پہلا مفکر شمار ہوتا ہے، جس نے ریشنل بنیادوں پر عیسائیت پر فلسفیانہ ضربیں لگائیں' نے کہا:

''وہ ایک ایسی چیز کو حق کیوں کہے جو محض تصوراتی معلوم ہوتی ہے۔''

یعنی خدا، جنت، دوزخ، حشر، عدالت، وغیرہ۔ ڈیکارٹ کا کہنا تھا کہ:

''علمی اور عقلی بنیادوں پر کوئی بھی انسان اپنے سوا کسی بھی چیز کو خواہ وہ خیالات ہوں یا اَقدار، معیاراتِ خیر وشر ہوں یا وحی اور چاہے خدا کا وجود......غرض کسی بھی چیز کا انکار کیا جاسکتا ہے۔ اکیلی میری ذات میرا وجود ہے، جس کا ہونا کسی شک وشبہے سے بالاتر ہے۔''

''میں اپنے اس دنیا میں ہونے کا جواز اپنے اندر رکھتا ہوں، میرا وجود کسی خارجی ذریعے، حقیقتِ مطلق یا خالقِ کائنات کا مرہونِ منت نہیں۔''

''میں سوچتا ہوں اس لیے میں ہوں۔''

سارتر جو مغرب کا اہم مفکر ہے' کے افکار کا خلاصہ یہ ہے کہ: ذات (Self) کے اندر اس بات کی استطاعت موجود ہے کہ وہ جیسا بننا چاہے بن سکتا ہے۔ وہ اپنی تخلیق خود کرسکتا ہے، اور دنیا کو جیسا بنانا چاہتا ہے بناسکتا ہے۔ انسان بنیادی طور پر کوشش کرتا ہے کہ خدا بن جائے، اگر وہ خدا نہیں بننا چاہتا تو یہ Bad Faith ہے۔

sam summer اپنی کتاب (struggling with God) میں کہتا ہے: ''خدا انسان ہے اور انسان خدا ہے، دونوں سے مراد زندگی ہے جو محبت کے لیے مصروفِ کشمکش ہے۔''

''فیور باخ'' خدا کے وجود کا ہی منکر ہے، اس کا کہنا ہے کہ خدا صرف انسان کے دل میں ہوتا ہے، اس سے باہر اس کا کہیں وجود نہیں۔

ڈیکارٹ کے گروہ کا خیال ہے کہ:

''خدا نے کائنات کو بنایا، اب اس کے بعد اس مشینری کو چلانے میں دخل نہیں دیتا۔ یہ مشین انسان کے سپرد کردی گئی ہے، لہٰذا اب کائنات میں الوہی منصب خود خدا کو مل چکا ہے۔''

یہ مغربی مفکرین کے خدا اور انسان کے متعلق خیالات ہیں۔ ان خیالات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے ہاں کوئی اَن دیکھی ہستی خدا کا وجود نہیں رکھتی، ان کے ہاں انسان ہی تمام طاقتوں کا مظہر ہے۔ مغرب' مذہب اور خدا کو کس طرح خیر باد کہہ چکا ہے؟ اس کا اظہار ڈنمارک کے بدبخت شاتم رسول فلیمنگ روز نے ان الفاظ میں کیا تھا کہ:

''ہم میں اور مسلمانوں میں فکری اور ثقافتی یا تہذیبی فرق یہ ہے کہ ہم نے تو خدا اور رسول اور کتاب کا حوالہ اپنے ذہنوں سے اُتار دیا ہے۔ ہم کوئی فیصلہ کرتے وقت یہ نہیں دیکھتے کہ بائبل میں کیا لکھا ہے؟ کوئی قانون طے کرتے وقت یہ نہیں دیکھتے کہ خدا کیا کہتا ہے؟ کوئی بات کہتے وقت عیسیٰ کا حوالہ نہیں دیتے کہ اس بارے میں انہوں نے کیا کہا تھا؟ ہم آزاد ذہن سے فیصلہ کرتے ہیں۔''

کانٹ......روشن خیالی کا مفکرِ اعظم

تحریکِ تنویر کا دوسرا بنیادی مفکر امانویل کانٹ (Immanuel Kant) ہے۔ یہ مغرب میں کانٹے کا مفکر گزرا ہے، اس نے ۱۷۸۴ء میں ایک مختصر تحریر ''روشن خیالی کیا ہے؟'' لکھی جس نے یورپی معاشرے پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ کانٹ انسانی ذات کے بارے میں کہتا ہے کہ: (Self) میں ایک ایسا جوہر موجود ہے جس کی بنیاد پر اور جس کے استعمال سے زمان ومکان سے ماوراء ہو کر حقیقت کو جانا جاسکتا ہے۔ بالفاظِ دیگر انسانی ذہن میں وہ ترتیب اور نظم موجود ہے جو انسانی تجربے کو ہیئت (Form) اور معانی (meaning) فراہم کر کے تجربے کو بہ حیثیت تجربہ ممکن بناتا ہے۔ کانٹ کے مطابق ذہن کی اس صلاحیت پر ایمان لانے کے بعد ایسے اصول وقوانین وضع کیے جاسکتے ہیں جو: ۱-مطلق (absolute) ہوں۔ ۲-یقینی (Certain) ہوں۔ ۳-آفاقی (Universal) ہوں۔ یعنی وہ ہر معاشرے، نظام اور ریاست پر عمومی اور یکساں طور پر قابلِ عمل وقابلِ نفاذ ہوں۔

کانٹ کے نزدیک مابعد الطبیعات (اِلہامی تعلیمات) کا سب سے بڑا جرم یہی ہے کہ وہ انسانی خودمختاری (Human Autonomy) کو خدا کے تابع کرتی ہے، جبکہ خودمختاری انسانیت کا جوہر ہے۔ کسی

بھی شے کے حق یا ناحق ہونے کا واحد معیار یہ ہے کہ وہ آفاقی تعقل سے ہم آہنگ ہے کہ نہیں؟!

روشن خیال کون؟

کانٹ کے مطالعے سے روشن خیالی کا ایک واضح تصور سامنے آتا ہے۔ کانٹ کے مطابق جب انسان اپنی عقل (Reason) کو کسی مقتدرہ (Authority) کے تابع کیے بغیر بذاتِ خود استعمال کرے تو وہ روشن خیال ہے، وہ لکھتا ہے:

"Enlightenment is man's emergence from his self-imposed immaturity immaturity is the inability to use one's understanding with out guidance from another this immaturity is self-imposed when its cause lies not in lack of understanding but in lack of resolve and courage to use it without guidance from another ."

’’روشن خیالی اس ذہنی ناپختگی سے نجات کا نام ہے جو ہیومن نے خود پر مسلط کر رکھی تھی۔ یہ ذہنی ناپختگی فی الاصل دوسروں کی رہنمائی کے بغیر اپنے ریزن کو استعمال نہ کر سکنے کی کیفیت کا نام ہے، مگر اس کی وجہ انسانی ریزن کا عدمِ وجود نہیں، بلکہ انسان میں اس جرأت اور پختہ ارادے کی کمی ہے جو اسے کسی اور کی رہنمائی کے بغیر اپنی عقل استعمال کرنے کے قابل بنا سکے۔‘‘

کانٹ کے مطابق ریزن کا مؤثر استعمال ہی انسانی ذہن وارادے کی بلوغت (Maturity) کو یقینی بناتا ہے۔ عدمِ بلوغت (Immaturity) سے بلوغت (Maturity) تک کا یہ عمل ’’روشن خیالی‘‘ ہی کے ذریعے ممکن ہوا ہے۔ عدمِ بلوغت سے کانٹ کی مراد انسانی ارادے کی وہ مخصوص کیفیت ہے جہاں انسان اپنی ریزن کی بجائے کسی اور مقتدرہ کے حق اور اختیار کو تسلیم کر لیتا ہے۔

یہ تحریکِ تنویر یا روشن خیالی کا بنیادی مقدمہ ہے کہ جب انسان کی سوچ اور ادراکات کی سطح یہاں تک پہنچ جائے کہ وہ محض اپنی عقل پر بھروسہ کرنے لگے تو یہ انسان روشن خیال ہو گیا، اس کی فکر نے جلا پالی، اور اب وہ خارجی عوامل پر بھروسہ کرنے کی بجائے اپنی عقل پر بھروسہ کرنے لگا ہے، چنانچہ روشن خیالی کسی بھی خارجی ذریعۂ علم (External Authority) کے انکار کا نام ہے۔

Enlightment کی تعریف یہ کی گئی ہے:

’’انسان کی صمدیت پر ایمان لانا اور یہ ماننا کہ ادراکِ حقیقت کے لیے کسی وحی کی ضرورت نہیں، بلکہ انسان اپنی کلیات کی بنا پر حقیقت جان سکتا ہے۔‘‘

(جاری ہے)

اُمتِ مسلمہ کی خصوصیت

اعتدال اور میانہ روی

مولانا عبدالمتین
لیاری، کراچی

قرآن کریم میں ہے:

’’وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا‘‘ (سورۃ البقرۃ:۱۴۳)

ترجمہ: ’’اور (مسلمانو!) اسی طرح تو ہم نے تم کو ایک معتدل امت بنایا ہے، تاکہ تم دوسرے لوگوں پر گواہ بنو، اور رسول تم پر گواہ بنے۔‘‘

یہ سورۂ بقرہ کی آیت ہے جس میں اللہ ربّ العزت اُمتِ محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے حوالے سے ایک خاص بات بیان فرماتے ہیں۔ قرآن کریم کے مذکورہ مضمون کے سیاق وسباق میں امتِ مسلمہ کے حوالے سے باتیں ذکر ہوئی ہیں: ۱- امت کے افراد یعنی امت مسلمہ۔ ۲- امت کا مرکز یعنی بیت اللہ۔ ۳- امت کے نبی یعنی نبی کریم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اُمتِ مسلمہ کی خصوصیت

اللہ ربّ العزت فرماتے ہیں کہ: ’’وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا‘‘ اور ’’(مسلمانو!) اسی طرح تو ہم نے تم کو ایک معتدل امت بنایا ہے۔‘‘

اللہ ربّ العزت اس آیتِ کریمہ میں اُمتِ محمدیہ کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے ایک خاص اصطلاح ذکر فرماتے ہیں کہ ہم نے تمہیں ’’امتِ وسط‘‘ بنایا ہے۔ عربی میں ’’وسط‘‘ درمیانہ پن، اعتدال، میانہ روی اور بیچ کے راستے کو کہتے ہیں۔

اس کی مثال کچھ یوں ہے کہ جو چیز درمیان میں ہوتی ہے، وہ زیادہ اچھی لگتی ہے اور زیادہ آویزاں

ہوتی ہے۔ اور اسی طرح کسی مجلس میں اسٹیج جب بنتا ہے تو بالکل بیچ میں بنتا ہے اور صدرِ مجلس کی کرسی بالکل اسٹیج کے بیچ میں لگائی جاتی ہے، تاکہ یہ معلوم ہوجائے کہ یہ اس مجلس میں سب سے معزز ہیں، تو اللہ ربّ العزت فرماتے ہیں کہ تمہاری بھی خصوصیت ایسی ہی ہے کہ تم افراط وتفریط کا شکار نہیں ہو، نہ تم حد سے آگے بڑھنے والے ہو اور نہ حد سے گزرنے والے ہو، اس لیے کہ ہم نے تمہیں ایک معتدل اور درمیانی امت بنایا جو اعتدال پر اور انصاف پر قائم رہنے والی ہے، تاکہ روزِ محشر تم لوگوں پر گواہ بن سکو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تم پر گواہ بن سکیں، لہٰذا تمہاری سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ تم امتِ معتدل اور امتِ وسط ہو اور درمیانے پن کے ساتھ رہنا جانتے ہو اور تمہیں اعتدال اور انصاف کرنا آتا ہے۔

روزِ محشر اُمتِ مسلمہ کی خصوصیت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا میں آنے سے پہلے ماضی میں بہت سی اُمتیں رہی ہیں، لیکن اللہ ربّ العزت نے کسی اُمت اور کسی قوم کو یہ اعزاز نہیں بخشا جو اُمتِ محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کو بخشا ہے۔ اس بات کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ روزِ محشر جب تمام لوگ جمع ہوں گے تو کل ایک سو بیس صفیں قائم ہوں گی، جن میں سے ۸۰ صفیں اُمتِ محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کی ہوں گی اور بقیہ چالیس صفیں دیگر اُمتوں کی ہوں گی۔

پچھلی امتوں میں افراط وتفریط اور اُمتِ محمدیہ کی فضیلت

پچھلی جتنی اُمتیں گزری ہیں ان میں یہی خرابی پیدا ہوگئی تھی کہ وہ بات کو بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کرتے یا بہت ہی زیادہ معمولی بنادیتے تو اُمتِ محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کی یہی خصوصیت بتائی کہ یہ باتوں کے اعتدال کو جانتی ہے اور دین وشریعت کے مزاج کو سمجھ کر اس پر عمل کرنا اس اُمت کو آتا ہے، اسی وجہ سے اس امت کو آخری اور سب سے زیادہ فضیلت والی اُمت قرار دیا جارہا ہے۔

فضیلت وانعام کا یہ سلسلہ اللہ ربّ العزت نے بنی اسرائیل کو بھی عطا فرمایا، لیکن انہوں نے افراط و تفریط سے کام لیا اور بالآخر بہت سی خرافات میں مبتلا ہوگئے، یہاں تک کہ سیدنا عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دے کر توحید تک کا انکار کردیا اور عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نعوذ باللہ! اللہ کا بیٹا مان لیا تو ایک طرف یہ غلطی کررہے ہیں کہ نبیوں کو خدا کا مقام دے رہے ہیں اور دوسری طرف معجزات کا انکار کررہے ہیں، گویا ان میں درمیانہ پن نہیں رہا کہ ایک طرف اتنا اونچا مقام دے رہے ہیں کہ بات کو آسمان تک پہنچاتے ہیں اور دوسری طرف نبی ان کے سامنے معجزات دکھاتے ہیں تو وہ انکار کرلیتے ہیں۔

یہی بات اگر صحابہؓ میں دیکھی جائے تو ان کا مزاج اعتدال سے بھرپور نظر آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے

ایک اشارے پر ہر صحابیؓ اپنی جان و مال قربان کرنے کو تیار ہے، لیکن کبھی یہ نہیں کہتا کہ میں رسول ﷺ کو نعوذ باللہ! خدا کا درجہ دوں گا، بلکہ کہتا یہی ہے کہ: ’’اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ‘‘ ’’میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔‘‘

آپ ﷺ کا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اعتدال کی تربیت دینا

’’عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ يَقُولُ: جَاءَ ثَلَاثَةُ رَهْطٍ إِلٰى بُيُوتِ اَزْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْاَلُوْنَ عَنْ عِبَادَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَلَمَّا أُخْبِرُوْا كَاَنَّهُمْ تَقَالُّوْهَا فَقَالُوْا وَأَيْنَ نَحْنُ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَمَا تَأَخَّرَ، قَالَ أَحَدُهُمْ: أَمَّا أَنَا فَإِنِّيْ أُصَلِّيْ اللَّيْلَ أَبَدًا وَقَالَ آخَرُ: أَنَا أَصُوْمُ الدَّهْرَ وَلَا أُفْطِرُ وَقَالَ آخَرُ أَنَا أَعْتَزِلُ النِّسَاءَ، فَلَا أَتَزَوَّجُ أَبَدًا فَجَاءَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَيْهِمْ فَقَالَ: أَنْتُمُ الَّذِيْنَ قُلْتُمْ كَذَا وَكَذَا أَمَا وَاللهِ إِنِّيْ لَأَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ وَأَتْقَاكُمْ لَهٗ لٰكِنِّيْ أَصُوْمُ وَأُفْطِرُ وَأُصَلِّيْ وَأَرْقُدُ وَأَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ.‘‘ (مشکوٰۃ،ص:۱۴۵)

’’حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: تین اشخاص نبی ﷺ کی عبادت کے متعلق پوچھنے کے لیے نبی ﷺ کی ازواجِ مطہراتؓ کے پاس آئے، جب انہیں اس کے متعلق بتایا گیا، تو گویا انہوں نے اسے کم محسوس کیا، چنانچہ انہوں نے کہا: ہماری نبی ﷺ سے کیا نسبت؟ اللہ نے تو ان کی اگلی پچھلی تمام خطائیں معاف فرمادی ہیں، ان میں سے ایک نے کہا: میں تو ہمیشہ ساری رات نماز پڑھوں گا۔ دوسرے نے کہا: میں دن کے وقت ہمیشہ روزہ رکھوں گا اور افطار نہیں کروں گا اور تیسرے نے کہا: میں عورتوں سے اجتناب کروں گا اور میں کبھی شادی نہیں کروں گا۔ نبی ﷺ ان کے پاس آئے اور پوچھا: تم وہ لوگ ہو جنہوں نے اس طرح، اس طرح کہا ہے، اللہ کی قسم! میں تم سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں اور تم سے زیادہ تقویٰ رکھتا ہوں، لیکن میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، رات کو نماز پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور میں عورتوں سے شادی بھی کرتا ہوں، پس جو شخص میری سنت سے اِعراض کرے، وہ مجھ سے نہیں۔‘‘

بہت ہی خوب صورت اور تسلی بخش انداز میں رسول اللہ ﷺ نے صحابہؓ کے توسط سے اُمت کو اعتدال کا پیغام دیا اور اپنی مثال دے کر بیان فرمایا، تا کہ اس پر عمل کرنا، مشاہدہ کرنا، سیکھنا آسان ہو جائے اور ایک حتمی نکتہ یوں بیان فرمایا کہ: یہی میرا طریقہ ہے، یہی شریعت ہے اور اسی معتدل انداز میں دنیا و آخرت کی کامیابی

ہے، باقی جو یہود و نصاریٰ کی طرح افراط وتفریط کا شکار ہوگا، اس کا امتِ مسلمہ سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ اس امت کی پہچان ہی اعتدال ہے۔

شریعت کا منہج ومزاج

شریعت یہ نہیں بتاتی کہ زندگی میں بیک وقت دین رہے گا یا دنیا رہے گی، یہ نہیں کہ اگر میں عبادت میں مگن رہا تو کسی سے تعلق نہیں رکھوں گا، نہ یہ کہ میں مکمل بازار سے چمٹ جاؤں یا پھر مسجد سے، بلکہ شریعت بتاتی ہے کہ تم نے دین و دنیا کو ساتھ ساتھ لے کر چلنا ہے۔ تم نے تجارت بھی کرنی ہے اور عبادت کے فرائض بھی انجام دینے ہیں، تم نے اللہ کے حقوق بھی ادا کرنے ہیں اور اللہ کے بندوں کے حقوق بھی ادا کرنے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ تم اللہ کے حقوق ادا کرنے میں بندوں کے حقوق سے غافل ہو جاؤ، اور نہ ایسا کہ بندوں کی خدمت میں ایسے لگے رہو کہ خدا کی بندگی ہی بھول جاؤ۔

البتہ شریعت فرق سمجھا دیتی ہے کہ تم مال کے لیے محنت ضرور کرو، لیکن اسے اپنی ضرورت سمجھو، اپنا مقصد مت سمجھو، ورنہ تم ''حبِ مال'' کی بیماری کا شکار ہو جاؤ گے۔ اسی طرح دنیا داری کرو، لیکن دنیا کے لیے اتنی ہی کوشش کرو جتنا تمہیں یہاں رہنا ہے، اور آخرت کے لیے اتنی کوشش کرو جتنا تمہیں وہاں رہنا ہے۔ اگر تم دنیا کی مختصر سی زندگی کے لیے آخرت والی محنت کرنا شروع کرو گے تو تم ''حبِ دنیا'' کی بیماری میں مبتلا ہو جاؤ گے، جسے رسول اللہ ﷺ تمام خرابیوں کی جڑ والی بیماری قرار دیتے ہیں۔

عقائد میں اعتدال کی تعلیم

ایک مسلمان کچھ اہم باتوں پر ایمان لے آتا ہے، لیکن اسے یہ سمجھنا بہت ضروری ہے کہ عقائد میں تمام عقائد ایک برابر نہیں، بلکہ ان میں ایک ترتیب قائم ہے، مثلاً توحید کو عقائد میں سب سے پہلا درجہ حاصل ہے اور رسالت کو دوسرا۔ اب اگر کوئی عقیدۂ رسالت پر اتنا زور دے کہ اسے توحید سے بھی زیادہ اہم ثابت کرے تو یہ اعتدال کی پٹڑی سے ہٹ جانے والی بات ہے۔

اسی طرح عقائد میں اعتدال نہ ہونے کی ایک بڑی شکل یہ ہے کہ عقیدۂ توحید کو اس درجہ شدت سے بیان کیا جائے کہ امت کے ہر دوسرے فرد کو مشرک سمجھنے لگے۔ توحید پر ایمان لانے کا یہ مطلب ہرگز درست نہیں کہ اولیاء اللہ کی گستاخی کی جائے، ان کی کرامات کا انکار کیا جائے اور توحید کو سمجھانے کے بہانے اہل اللہ پر معاذ اللہ! مزاحیہ جملے کسے جائیں۔ یہ توحید کے بیان کرنے کا طریقہ ہے، نہ ہی دعوتی حکمت عملی کے موافق ہے۔

بے شک توحید دین کا مرکزی ستون ہے اور شرک سب سے گناہِ عظیم، بلکہ ظلمِ عظیم ہے، لیکن اس کی آڑ میں اسی توحید کے داعی صوفیاء اور اولیاء کی کردار کشی کرتے ہوئے سستے بازاری جملوں کا استعمال ان بزرگوں کے بالکل بھی شایانِ شان نہیں۔ یہ سب کے سب توحید کے حوالے سے اعتدال سے ہٹ جانے والے رویے ہیں۔

اسی طرح انبیاء کرام علیہم السلام اور بزرگانِ دین کے ساتھ عقیدت ومحبت کا تعلق پیدا ہوجانا ایک بہت بڑی نعمت ہے اور اس کے بغیر دین کے بہت سے پہلو ادھورے رہ جاتے ہیں، لیکن اپنے سوا ہر ایک کو گستاخ قرار دینا اور محبت وعقیدت کو اپنا ٹھیکہ سمجھ لینا غلط بات ہے۔ اسی طرح عقیدت کی آڑ میں اولیاء کو صحابہؓ سے بلند مرتبہ دینا یا انبیاء علیہم السلام کو خدا کا مرتبہ دینا اور پھر عقیدت کی اوڑھنی اوڑھ کر شرک وبدعت کے دھندوں میں لگ جانا، اسلاف کے مدفن بیچ کھانا اور یہ سب عاشقِ رسول کا لیبل لگا کر کرنا، جس پر اضافہ یہ کہ اس عقیدت کے سہارے خود کو توحید، نماز، روزہ اور حج جیسی عبادات سے بری سمجھنا، یہ سوچ کر کہ یہی عقیدت میری نجات کے لیے کافی ہے، یہ جہالت کی انتہا ہے، جو کہ اُمتِ مسلمہ کی اعتدال والی خصوصیت کے یکسر خلاف ہے۔

اس میں اعتدال کا طریقہ یہ ہے کہ توحید پر ایمان رکھے، لیکن بزرگانِ دین کے مقام کو بھی سمجھے، رسالت پر ایمان رکھے، لیکن عقیدت ومحبت کا درست استعمال بھی سیکھے۔

تحریکات میں اعتدال کی ضرورت

اعتدال کا جنازہ نکالنے میں مختلف دینی تحریکات کے ناسمجھ کارکن بھی پیش پیش رہتے ہیں اور ہر ایک کی یہ چاہت ہوتی ہے کہ دین کا کام اسی طرز پر کرنے کی ضرورت ہے جس طرز پر ہماری تحریک کارفرما ہے، حالانکہ یہ بات ہم بخوبی جانتے ہیں کہ دین کے مختلف شعبہ جات ہیں اور تمام شعبہ جات کو ایک ساتھ کرنے کی خصوصیت صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھی جو تلاوتِ کتاب، تعلیمِ کتاب، تعلیمِ حکمت اور تزکیۂ نفس کی صورت میں قرآن آپ کے اوصاف ومناصب کے ضمن میں بیان کرتا ہے۔

باقی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے جاتے ہی اُمت کے پہلے طبقے یعنی صحابہؓ کی جماعت میں ہی یہ سارے کام خوب صورت انداز میں تقسیم ہوچکے تھے۔ ٹھیک یہی ترتیب امت کے موجودہ طبقے میں پائی جاتی ہے جو کہ سیاست، تعلیم وتعلُّم، سلوک وتصوف، دعوت وتبلیغ، تحقیق، تصنیف وتالیف، جہاد واعلائے کلمۃ اللہ وغیرہ کی صورت میں اُمت کررہی ہے، ان میں سے کسی ایک کام کو ناگزیر سمجھنا اور باقی سب کو بے کار یا کم اہمیت کا حامل سمجھنا یا پھر ہر ایک سے اپنی تحریک کے نظم کا تقاضا کرنا یہ سب کے سب بے اعتدالی کے رویے ہیں اور ان سب کو اعتدال پر لانے کی یہی ایک صورت ہے کہ اُمت کے کسی ایک شعبے پر لگ کر محنت کی جائے اور بقیہ شعبوں کو اپنا حریف اور مخالف سمجھنے کی بجائے ان کا رفیق بنا جائے۔ ضروری نہیں کہ رفیق بن کر اپنے آپ کو

گھماتا پھرے، کبھی ایک کے ساتھ تو کبھی کسی اور کے ساتھ، البتہ کسی ایک شعبے میں یکسوئی کے ساتھ جڑ جائے اور بقیہ شعبہ جات کی مخالفت نہ کرے۔

دین ودنیا میں اعتدال کی تعلیم

حدیث مبارکہ ہے:

''وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍوؓ قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلٰى رَسُولِ اللهِ ﷺ فَاسْتَأْذَنَهٗ فِي الْجِهَادِ فَقَالَ: أَحَيٌّ وَالِدَاكَ؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: فَفِيْهِمَا فَجَاهِدْ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِيْ رِوَايَةٍ: فَارْجِعْ إِلٰى وَالِدَيْكَ، فَأَحْسِنْ صُحْبَتَهُمَا.'' (مشکوٰۃ:۳۸۱۷)

''حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں، ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے آپ سے جہاد میں شریک ہونے کی اجازت طلب کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تیرے والدین زندہ ہیں؟'' اس نے عرض کیا: جی ہاں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ان دونوں (کی خدمت) میں مجاہدہ (انتہائی کوشش) کر۔ ایک دوسری روایت میں ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنے والدین کے پاس چلا جا اور اُن سے اچھی طرح سلوک کر۔''

معلوم ہوا کہ جہاد تو بہت ہی عظیم عمل ہے، لیکن اس صحابیؓ کے لیے اس وقت اس کے والدین کی خدمت کرنا زیادہ عظیم عمل تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو والدین کے ہاں جا کر اُن کی خدمت میں لگے رہنے کا حکم دیا اور آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے اس فیصلے سے گویا شریعت کا یہ مزاج سمجھایا کہ تمہارے لیے اس موقع پر دین پر عمل کرنے کی بہتر صورت کون سی ہے۔

خالق اور مخلوق کے حقوق کی ادائیگی میں اعتدال

علماء یہ مسئلہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ایک ایسا شخص ہے کہ جس کا گھر مسجد حرام کے بالکل قریب ہے، اتنا کہ وہ گھر سے نکلے اور مسجد حرام میں پہنچ جائے، لیکن اس کے گھر میں اس کی والدہ بیمار ہیں اور انہیں تیمارداری کی ضرورت ہے اور وہ مریضہ ایسی صورت حال کا شکار ہے کہ اگر کوئی اسے چھوڑ کر چلا جائے تو اس کی حالت مزید بگڑ سکتی ہے، ضرورت ہے کہ اس کے پاس کوئی نہ کوئی رہے اور جب اسی دوران عشاء کی نماز کا وقت ہوتا ہے تو اس کا اکلوتا بیٹا یہ کہے کہ میں جاؤں اور مسجد حرام میں نماز پڑھوں، تاکہ مجھے ایک لاکھ نمازیں پڑھنے کا ثواب ملے تو شریعت اس کے متعلق رہنمائی کرتی ہے کہ تم ایک لاکھ نمازیں پڑھنے کا ثواب حاصل مت کرو، بلکہ فی الحال تم گھر میں ہی نماز پڑھو اور اپنی ماں کا خیال رکھو، اس موقع پر تمہارے لیے یہ زیادہ بہتر ہے۔

شریعت کی تعلیمات ایسی ہیں جو اللہ کے حقوق اور بندوں کے حقوق کے درمیان درمیانی راہ دکھلاتی ہیں کہ دنیا کے ایسے بھی نہ بنو کہ دین کو بالکل اپنی زندگی سے ہی نکال دو اور ایسے بھی نہ بنو کہ دنیا ہی کو اپنے دل میں بسا بیٹھو، کیونکہ تمہاری سب سے بڑی خصوصیت ہی یہ ہے کہ تم امتِ معتدل اور امتِ وسط ہو اور درمیانے پن کے ساتھ رہنا جانتے ہو اور تمہیں اعتدال اور انصاف کرنا آتا ہے۔

انصاف اور اعتدال

ایک موقع پر کسی قبیلے کے جنگ و جدل کا معاملہ پیش آیا، آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے صحابہؓ کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا:

’’انْصُرْ أَخَاكَ ظَالِـمًا أَوْ مَظْلُومًا، قُلْنَا: يَا رَسُولَ اللهِ! نَصَرْتُهُ مَظْلُومًا، فَكَيْفَ أَنْصُرُهُ ظَالِـمًا ؟ قَالَ: تَكُفُّهُ عَنِ الظُّلْمِ ، فَذَاكَ نَصْرُكَ إِيَّاهُ۔‘‘ (جامع ترمذی:۲۲۵۵)

’’اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم‘‘ صحابہؓ نے کہا: اللہ کے رسول! میں نے مظلوم ہونے کی صورت میں تو اس کی مدد کی، لیکن ظالم ہونے کی صورت میں اس کی مدد کیسے کروں؟ آپ نے فرمایا: ’’اسے ظلم سے باز رکھو، اس کے لیے یہی تمہاری مدد ہے۔‘‘

آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو۔ اب صحابہؓ تو سوال کرنے والے تھے، انہوں نے پوچھ لیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مظلوم کی مدد کرنا تو سمجھ آتا ہے کہ اسے ظلم سے بچانا، لیکن ظالم کی مدد کرنے کا کیا مطلب ہے؟ تو آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ: ظالم کی مدد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اسے ظلم سے روکنا، یہی اس کی مدد ہے، تاکہ اسے مزید ظلم کرنے سے روک لیا جائے، یعنی اگر تمہارا مسلمان بھائی ظلم کر رہا ہے تو تمہیں اس کا بھی ساتھ دینا ہے اور ظلم سے روکنا ہے اور اگر تمہارا بھائی ظلم کا شکار ہے اور مظلوم ہے تو اس کی بھی تمہیں مدد کرنی ہے اور اسے ظلم سے بچانا ہے، شریعت نے دونوں کے متعلق احکامات سمجھا دیے کہ تم نے یہاں کون سا رویہ اپنانا ہے اور وہاں کیا رویہ اپنانا ہے۔

مال کمانے کے متعلق اعتدال

اگر کوئی کہے کہ میں کماتا ہی نہیں، کیونکہ کمانا دنیاداری ہے اور میں دیندار بننا چاہتا ہوں، فرمایا کہ: یہ غلط رویہ ہے، کیونکہ حلال کمائی بھی دینی فرائض میں شامل ہے، کتنی ہی ایسی عبادات ہیں جو مال خرچ کر کے ادا کی جاتی ہیں، جیسے زکوٰۃ، صدقہ، فطرہ، قربانی، حج، صلہ رحمی وغیرہ۔ اسی طرح اگر کوئی مال کو ہی اپنی زندگی کا مقصد بنا لے اور اس پر کمانے جمع کرنے کی دھن سوار ہو جائے تو شریعت رہنمائی کرتی ہے کہ یہ بھی غلط طریقہ ہے، کیونکہ

مال کو اللہ نے انسان کی خدمت وضرورت کے لیے پیدا کیا ہے، اپنے آپ کو اس پر کھپانے کے لیے پیدا نہیں کیا، لہٰذا تم مال کماؤ، مگر اسے اپنے مقصد کے لیے نہیں، بلکہ اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے، جب تمہاری ضرورت پوری ہوجائے تو تم مزید مال کو اپنا مقصد مت بناؤ۔

مال خرچ کرنے کے متعلق اعتدال

اسی طرح جب مال خرچ کرنے کی باری آتی ہے تو کوئی اپنے مال کو بے تحاشا خرچ کرتا ہے تو شریعت منع کرتی ہے کہ تم فضول خرچی اور اسراف سے بچو اور اگر کوئی اپنے مال کو خرچ ہی نہیں کرتا تو شریعت یہ کہتی ہے کہ تم کنجوسی سے بھی بچو، جیسے اللہ ربّ العزت قرآن مجید میں ارشاد فرماتے ہیں کہ:

''وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا'' (الفرقان:۶۷)

''اور جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں، نہ تنگی کرتے ہیں، بلکہ ان کا طریقہ اس (افراط وتفریط) کے درمیان اعتدال کا طریقہ ہے۔''

یعنی اللہ کریم ہمیں یہ بتلا رہے ہیں کہ رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو اعتدال اور میانہ روی پر قائم ہیں اور خرچ کرنے میں اعتدال پر قائم ودائم ہیں، اِفراط اور تفریط سے بچے ہوئے ہیں، کیونکہ جب فضول خرچی کرے گا تو پھر گناہ اور عیاشی میں مبتلا ہوجائے گا اور بہت سی غیر ضروری چیزوں کو ضروری سمجھ کر خریدنے کا بوجھ اُٹھائے گا اور اگر کنجوسی کرے گا تو زکوٰۃ، قربانی، حج، صدقہ خیرات، صلہ رحمی، اہل وعیال کے حقوق وغیرہ کیسے ادا کرے گا؟ اسی لیے شریعت نے اعتدال کی راہ دکھلائی کہ تمہیں اِنفاق بھی کرنا ہے اور اِسراف سے بھی بچنا ہے۔

نوافل اور فرائض کے درمیان اعتدال

فرائض وہ ہیں جو کسی حال میں معاف نہیں، جبکہ نوافل کہتے ہی اس عبادت کو ہیں جو لازم نہیں، بلکہ اضافی اجروثواب کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ اس حوالے سے بھی بہت افراط تفریط پائی جاتی ہے کہ ہم نوافل کو تو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ جتنا فرائض کو نہیں دیتے، جیسے فضیلت والی راتیں آجاتی ہیں تو ان میں ساری رات عبادت کی جاتی ہے، لیکن جب فجر کی فرض نماز ادا کرنے کا وقت آجاتا ہے تو یہی نفلی عبادت کرنے والے سب سو جاتے ہیں، اس صورت میں نفلی عبادت کو زیادہ اہمیت دی جارہی ہے جس سے متعلق کوئی باز پرس نہیں ہوگی، لیکن فرض کو چھوڑا جارہا ہے، حالانکہ پہلا سوال ہی قیامت کے دن فرض نماز سے متعلق ہوگا۔

اسی طرح قربانی کے موقع پر ہم میں سے جو قربانی کرنے کا اردہ کرتے ہیں وہ یکم ذی الحجہ سے قربانی تک اپنے ناخن اور جسم کے اضافی بالوں کو صاف نہیں کرتے، جبکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ ایک مستحب عمل ہے جس کا

مطلب جو یہ عمل کرے گا اسے ثواب ملے گا اور جو نہیں کرے گا اسے کوئی گناہ نہیں ملے گا، لیکن حیرت ہے کہ ایک شخص دس دن تک یہ نفلی کام کرتا رہتا ہے، ایک ایسا کام جو ثواب کا کام ہے، اگر نہیں کرے گا تو اسے گناہ بھی نہیں ملے گا، لیکن جیسے ہی وہ قربانی کرتا ہے تو اپنی داڑھی کے بال بھی صاف کردیتا ہے، حالانکہ وہ یہ بات جانتا ہے کہ اگر میں ان دس دنوں میں وہ بال کاٹ لیتا تو مجھے کوئی گناہ نہ ملتا، لیکن داڑھی کاٹنا گناہِ کبیرہ ہے، مکروہِ تحریمی ہے۔ ایک طرف نفلی عبادت کی فکر ہے اور دوسری طرف حرام کی بھی فکر نہیں تو یہ افراط وتفریط والی بات ہے، حد سے بڑھ جانا اور نوافل کو اتنی اہمیت دینا جو فرائض کو بھی نہیں دی جارہی اور مستحب کو جیسے تیسے کرنا، لیکن حرام کے معاملے میں کوئی فکر نہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کا مزاج نہیں سمجھا گیا اور دین کی جو حکمت والی درمیانی تعلیم ہے، اس کو نہیں سمجھا گیا۔

قبور سے متعلق اعتدال

قبروں سے متعلق ہم اِفراط وتفریط کی دو انتہاؤں پر کھڑے ہوئے ہیں، جبکہ شریعت یہاں بھی اعتدال ہی سکھاتی ہے، مثلاً: میت کو غسل دیتے وقت اعضاء کا خیال رکھو، زیادہ ٹھنڈا اور زیادہ گرم پانی کے بجائے نیم گرم پانی کا استعمال کرو، تدفین کے وقت اعزاز سے رکھو، جنازہ پڑھو، کندھا دو اور جب دفن کرلو تو قبر پر قدم مت رکھو، قبر کو اپنی نشست گاہ مت بناؤ، قبر کو مسمار مت کرو، یہ سب تمہارے اس مرحوم کے لیے احترام کی ایک معتدل شکل ہے۔

اسی طرح شریعت یہ بھی بتلاتی ہے کہ جو حد سے بڑھ جانے والے کام ہیں وہ بھی نہ کرو، قبر کی پختہ تعمیر مت کرو، مزار مت بناؤ، چراغ مت جلاؤ، قبر کا طواف نہ کرو، نہ ہی اسے سجدہ گاہ بناؤ، نہ صاحبِ قبر سے دعا مانگو، وغیرہ، گویا دونوں چیزیں ساتھ ساتھ سمجھا دیں کہ تم حد سے بڑھنے کی کوشش بھی مت کرو اور حد سے گرنے کی کوشش بھی مت کرو۔

شادی بیاہ کے موقع پر اعتدال

ہماری شادی بیاہ کی جو رسومات ہیں عام طور پر ان کے متعلق علماء یہ فرماتے ہیں کہ شادی شریعت کے مطابق کرو تو ہمارے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ شریعت کے مطابق شادی شاید سوگ منانے جیسا عمل ہے، اگر شادی شریعت کے مطابق ہوگی تو سوگ والا ماحول ہوگا، تسبیح پڑھنی ہوگی، قرآن خوانی یا آیتِ کریمہ کا ختم کرنا ہوگا اور پھر ایسا لگے گا کہ خوشی کا ماحول ہی نہیں ہے، جبکہ ایسا بالکل نہیں ہے، شادی ایک خوشی کا موقع ہے اور اسے خوشی خوشی ہی منانا چاہیے اور خوشی منانے کا جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے اس سے منع نہیں کیا جارہا، لیکن چند شرائط بتائی

جارہی ہیں جن کا لحاظ ضروری ہے، مثلاً بے پردگی نہ ہو، ڈول باجے نہ ہوں، ہندوانہ رسم ورواج نہ ہوں، باقی ان شرائط کے ساتھ جیسے چاہو اپنی خوشی منالو، یہاں تک کہ آپ علیہ السلام خود اس کی ترغیب دے رہے ہیں کہ نکاح کی تقریب کا بھرے مجمع میں اہتمام کرو، مسجد میں نکاح کرو، ولیمہ کر کے سب کو اپنی خوشی میں شریک کرو، وغیرہ۔

آپس کے تعلقات میں اعتدال

اکثر ہمارے آپس کے تعلقات میں بھی افراط وتفریط کی جھلک دکھائی دیتی ہے، کسی سے اگر تعلق بنانا ہے تو ایسا تعلق قائم کریں گے کہ اس پر جان بھی نثار کریں گے، ہر وقت اسی کے ساتھ بیٹھک لگائیں گے، گپ شپ لگی رہے گی، وقت بے وقت یار کو ڈھونڈتے رہیں گے، کہیں آنا جانا، تقریبات میں شرکت کرنا، یہاں تک کہ لین دین بھی اسی کے ساتھ کرنے کا سوچیں گے، لیکن ایک اختلاف سے یہ گہری دوستی دشمنی میں بدل جاتی ہے اور پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ایک دوسرے کی شکل دیکھنا بھی گوارہ نہیں ہوتا۔ یہ ہمارے تعلقات میں پائی جانے والی بڑی عام بے اعتدالی ہے جو ہم کرتے رہتے ہیں۔ اب شریعت یہ نہیں کہتی کہ ہم ہر ایک سے دوستیاں کرتے پھریں اور ہر ایک کو اپنے سر کا تاج بنالیں اور ہر ایک سے لین دین شروع کردیں، بلکہ عام مسلمانوں کے حوالے سے جو روش اپنانی چاہیے، اس کے متعلق فرمایا کہ: ''ایک مسلمان کے مال، جان، عزت وآبرو کی تم حفاظت کرو، اس کے ساتھ سلام علیک رکھو، ضرورت پڑنے پر اس کی مدد کرو۔'' بس اتنا ہی کافی ہے۔ باقی کسی سے ایسی دوستی کرنا کہ اس کے غلط کو بھی صحیح قرار دینا اور کسی سے ایسی نفرت کرنا کہ اس کی ساری اچھائیاں نظر انداز کرنا، دونوں رویے غلط ہیں۔ اگر ہم کسی سے تعلق رکھتے ہیں تو اس میں خوبی بھی ہوسکتی ہے اور خامی بھی، تو ہم اس کی خوبی پر نظر رکھیں اور اس کی خامی کو نظر انداز کریں۔

ضرورت ہے کہ ہم اپنے تعلقات میں بھی اعتدال کا لحاظ رکھیں، تاکہ ایسا نہ ہو کہ کسی ایک اختلاف کی وجہ سے ہم تعلق کو دشمنی میں بدل دیں، یہ بڑے ظلم کی بات ہے، مثلاً: کسی سے پوچھا جائے کہ: ''آپ کا رابطہ نہیں آج کل فلاں شخص سے خیریت؟'' جواب آئے کہ اس نے مجھ سے ایک مرتبہ ایسی بات کردی تھی کہ میرا بس دل ہی ٹوٹ گیا، اب یہ بھی ختم، یہ بھی ختم اور یہ بھی ختم، یہ غلط طریقہ ہے۔

مزاج کا اعتدال

کوئی اپنے مزاج میں اتنی زیادہ بہادری رکھتا ہے کہ وہ ظالم بن جاتا ہے، تو شریعت اس رویے کی مذمت کرتی ہے اور اگر کوئی اپنے مزاج میں اتنا ڈھیلا پن لاتا ہے کہ بالکل بزدل ہی بن جاتا ہے تو شریعت اس بزدلی کی بھی ممانعت کرتی ہے اور تاکید کرتی ہے کہ تم اپنے اندر شجاعت پیدا کرو، اگر تم بزدل بنے رہو گے تو جہاد کیسے کرو گے؟! صبر آزما حالات کا مقابلہ کیسے کرو گے؟! اسی طرح اگر کوئی شخص اس قدر احساسِ کمتری کا شکار ہے

کہ وہ ناشکری میں مبتلا ہونے لگتا ہے تو شریعت کہتی ہے کہ یہ ناشکری تمہیں اللہ کی رحمت سے مایوس کر سکتی ہے اور کفر کے کنویں میں دھکیل سکتی ہے اور کوئی بہت زیادہ احساسِ برتری کا شکار ہے، جس سے گھمنڈ اور تکبر میں مبتلا ہو رہا ہے تو شریعت اس رویے کی بھی روک تھام کرتی ہے کہ تم اپنے اندر تواضع اور عاجزی پیدا کرو، خود کو بہت گھٹیا بھی مت سمجھو اور خود کو بہت اعلیٰ بھی مت سمجھو، اپنے اندر عاجزی کی روش پیدا کر کے اعتدال پر قائم رہو۔

عقل اور جذبات میں میانہ روی

اسی طریقے سے انسان میں عقل اور جذبات کے بڑے شدید مادے پائے جاتے ہیں جو کہ اکثر اوقات انسان کو اعتدال پر قائم رہنے نہیں دیتے، اسی آیت کی روشنی میں یہ اہم اصول سمجھنے کو ملتا ہے کہ تم امتِ وسط ہو، تم دین کا مزاج اور دین کی جو اصل بنیاد اور ریڑھ کی ہڈی ہے، اس کو سمجھنے کی کوشش کرو اور اپنے جذبات اور عقل کو بیچ میں مت لاؤ، چونکہ انسان ایسا ہے کہ کبھی وہ جذبات میں آ کر غلط فیصلہ کرتا ہے، اور کبھی اپنی عقل کے خودساختہ پھندے میں پھنس کر ناقص فیصلہ کر سکتا ہے، نفسانی خواہشات کا شکار ہو سکتا ہے، اس لیے اس امت کو سمجھایا کہ تم فیصلے اپنی طبیعت کے مطابق مت کرو، بلکہ جیسے شریعت رہنمائی کرے ویسے فیصلے کرو، چاہے تمہاری عقل میں آئے یا نہ آئے، چاہے تمہارا دل مانے یا نہ مانے، چاہے تمہاری طبیعت کے مطابق ہو یا نہ ہو، عین ممکن ہے کہ تمہاری طبیعت میں افراط و تفریط پائی جاتی ہو یا تمہاری عقل اونچ نیچ کا شکار ہو اور اس طرح تمہاری خواہش کے چکر میں معاملہ بگڑ جائے، لیکن جب تم اپنے آپ کو عقلی اور نفسانی خواہشات سمیت شریعت کے حوالے کرو گے تو شریعت تمہیں نہ حد سے زیادہ آگے بڑھنے دے گی، نہ حد سے گرنے دے گی، کیونکہ شریعت میں اعتدال پایا جاتا ہے، بالآخر نتیجہ بھی اعتدال والا سامنے آئے گا۔

خلاصہ

اللہ ربّ العزت نے اُمتِ محمدیہ کی جو خصوصیت اس آیت میں بیان کی کہ: ''وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا''، ''اور اسی طریقے سے ایک بہت بڑی نعمت ہم نے تمہیں یہ دی کہ ہم نے تمہیں ایک معتدل اُمت بنادیا۔'' لہٰذا ہمیں اپنے ہر عمل میں اعتدال پیدا کرنے کی ضرورت ہے، عقیدے میں بھی، عبادت میں بھی، حقوق کی ادائیگی میں بھی، خرچ میں بھی، سیاست میں بھی، نیکیوں میں بھی، آپس کے تعلقات میں بھی اور ہمارے مزاج اور اہم فیصلوں میں بھی اعتدال ہونا چاہیے، تاکہ ہم امتِ مسلمہ کے تقاضوں کو پورا کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

ماہِ رجب سے متعلق فضائل واحکام

قرآن وحدیث کی روشنی میں

مولوی محمد طیب حنیف
متعلم تخصصِ علوم حدیث، جامعہ

اللہ رب العزت نے اپنی تمام مخلوق میں انسان کو اشرف واکرم بنایا، اس کی فطرت میں نیکی وبدی، بھلائی وبرائی، تابعداری وسرکشی اور خوبی وخامی دونوں ہی قسم کی صلاحیتیں اور استعدادیں یکساں طور پر رکھ دی ہیں۔ نیز انسانوں میں سے بعض کو بعض پر فضیلت بخشی، بعض کو رفعِ درجات سے نوازا تو کسی کو اپنے سے ہم کلامی کا شرف عطا کیا۔ اسی طرح دیگر مخلوقاتِ عالم میں فرقِ مراتب کا لحاظ رکھا، چنانچہ زمین وآسمان، انس وجن میں تفاوتِ مراتب نمایاں ہے۔ اسی طرح مہینہ وایام میں بھی بعض کو جزوی فضائل کے لحاظ سے مقدم رکھا ہے، اسی بنا پر قمری مہینہ رجب کو بعض پہلوؤں کے لحاظ سے دیگر مہینوں سے امتیاز حاصل ہے۔ ذیل میں ماہِ رجب کے متعلق چند فضائل واحکام پیش خدمت ہیں:

''رجب'' کی وجہ تسمیہ

علامہ عبدالرؤف مناوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''سمي الشهر رجب رجبا؛ لأنهٗ يترجب؛ أي: يتكثر و يتعظم فيه خير كثير لشعبان ورمضان'' [۱] عربوں میں بطور صیغہ یوں استعمال کیا جاتا ہے: ''رجب فلانا أي هابه وعظمه'': عربوں میں اس مہینہ کی عظمت وتقدس کے سبب اس کو ''رجب'' سے تعبیر کیا جاتا تھا، یہی وجہ ہے کہ عربوں میں اس کو ''رجب الأصم'' کے نام سے بھی یاد کیا جاتا تھا، جس کا معنی یہ ہے کہ اس ماہ کی عظمت وتقدس کی وجہ سے غیر مسلم بھی اس میں جنگ وحرب سے خود کو باز رکھتے تھے، نیز اس ماہ میں ''يا قوماه و ياصباحاه'' جیسی ایمرجنسی کی صدائیں بلند کرنے کی نوبت نہیں آتی تھی۔ [۲]

اس کی تائید ایک مرفوع روایت سے بھی ہوتی ہے:

’’إن رجب شَهْرُ اللهِ، وَ يُدْعَى الأَصَمَّ، وَكَانَ أَهْلُ الْجَاهِلِيَّةِ إِذَا دَخَلَ رَجَبُ يُعَطِّلُوْنَ أَسْلِحَتَهُمْ وَ يَضَعُوْنَهَا، فَكَانَ النَّاسُ يَأْمَنُوْنَ وَتَأْمَنُ السُّبُلُ، وَلَا يَخَافُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا حَتّٰى يَنْقَضِيَ.‘‘(۳)

’’بلاشبہ ماہ ’’رجب‘‘ کو اللہ رب العزت کی جانب سے ایک خاص نسبت حاصل ہے، اس کو ’’رجب الأصم‘‘ کے نام سے پکارا جاتا ہے، جاہلیت کے دور میں بھی اس مہینہ کے آغاز پر ہر دوفریق اپنے ہتھیار ڈال کر خود کو جنگ وقتال سے باز رکھتے تھے، اور اس مہینہ میں امن واطمینان سے زندگی بسر کرتے تھے، جس سے راستے بھی پُرامن ہوجاتے تھے، اس مہینہ کے اختتام تک کسی قسم کا خوف وخطر باقی نہ رہتا تھا۔‘‘

رجب الأصم کہنے کی وجہ

اس حوالہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک موقوف روایت ہے:

’’وَسُمِّيَ أَصَمَّ؛ لأَنَّ الْمَلائِكَةَ تُصَمُّ أَذَانُهَا؛ لِشِدَّةِ ارْتِفَاعِ أَصْوَاتِهَا بِالتَّسْبِيْحِ وَالتَّقْدِيْسِ.‘‘(۴)

’’اس ماہِ رجب کو ’’الأصم‘‘ کے ساتھ موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ فرشتوں کی تسبیح وتقدیس کی بلند صداؤں کی وجہ سے گویا لوگوں کے کان بہرے ہوجاتے تھے۔‘‘

ماہِ رجب کی فضیلت

ماہِ رجب چونکہ اشہرِحرم کا حصہ ہے، اس بنا پر اشہرِ حُرم سے متعلق وارد عمومی فضائل بھی اس کی اہمیت کو اُجاگر کرنے کے لیے کافی ہیں، لیکن بعض خصوصی فضائل کا بھی ثبوت ملتا ہے، جس سے مزید اہمیت کا اندازہ لگانا ممکن ہے، یہی وجہ ہے کہ ابن دحیہؒ نے اس مہینہ کے اٹھارہ نام ذکر کیے ہیں (۵)، لہٰذا ’’کثرة الأسماء تدل علٰی شرف المسمّٰی‘‘ (ناموں کی کثرت مسمّٰی کے شرف وفضیلت کی دلیل ہے) کے ضابطہ کے تحت اس کی اہمیت وفضیلت واضح ہوتی ہے، بہرحال قرآن وحدیث کی روشنی میں چند فضائل پیش خدمت ہیں:

❶-قابلِ احترام مہینہ

ماہِ رجب ان مہینوں میں سے ہے جن کو ’’أشهر الحرم‘‘ سے جانا جاتا ہے، ان مہینوں میں مشرکینِ مکہ بھی خون خرابے سے احتراز کرتے تھے، ان کی فضیلت کا قرآن مجید میں یوں ذکر ہے:

’’إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ‘‘(۶)

’’یقیناً ان مہینوں کا شمار (جوکہ) کتابِ الٰہی میں اللہ کے نزدیک (معتبر ہیں) بارہ مہینے (قمری) ہیں، جس روز اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین پیدا کیے تھے (اسی روز سے اور) ان میں چار مہینے ادب کے ہیں۔‘‘ (بیان القرآن)

’’عن أبی بکرة رضي الله عنه، عن النبي ﷺ، قال: الزمان قد استدار کهیئته يوم خلق الله السماوات والأرض، السنة اثنا عشر شهرا، منها أربعة حرم، ثلاث متواليات: ذوالقعدة وذوالحجة والمحرم، ورجب مضر الذي بين جمادى وشعبان.‘‘(۷)

’’ زمانہ پھر اپنی پہلی اسی ہیئت پر آ گیا ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین کو پیدا کیا تھا۔ سال بارہ مہینے کا ہوتا ہے، ان میں سے چار حرمت والے مہینے ہیں: تین تو لگا تار یعنی ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرم، اور چوتھا رجبِ مضر جو جمادی الاخریٰ اور شعبان کے درمیان میں ہے۔‘‘

❷ - نیک عمل کے اجر میں اضافہ اور برائی کی شناعت میں زیادتی

محققین کے مطابق ان مہینوں میں بطور خاص گناہوں سے بچنے اور نیک اعمال کا اہتمام کرنا چاہیے، اللہ رب العزت نے جس طرح بعض کو بعض پر فوقیت وفضیلت سے نوازا ہے، یہ ایام بھی اللہ کی عطا ہیں، جس کے سبب ان ایام کو خاص فضیلت بخشی ہے، اور ان میں گناہوں کے وبال میں اضافہ ہے، اور یہ متفقہ ضابطہ ہے کہ زمان یا مکان کی خصوصیت سے اس عمل میں شدت پیدا ہوجاتی ہے، چنانچہ آیتِ کریمہ ’’فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ أَنْفُسَكُمْ ‘‘، ’’سو ان مہینوں میں اپنے آپ پر ظلم نہ کرنا‘‘ کے تحت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے موقوف روایت ہے، فرمایا:

’’لَا تَظْلِمُوْا أَنْفُسَكُمْ فِيْ كُلِّهِنَّ، ثُمَّ اخْتَصَّ مِنْ ذٰلِكَ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ فَجَعَلَهُنَّ حُرُمًا، وَعَظَّمَ حُرُمَاتِهِنَّ، وَجَعَلَ الذَّنْبَ فِيْهِنَّ أَعْظَمَ، وَالْعَمَلَ الصَّالِحَ وَالْأَجْرَ أَعْظَمَ.‘‘(۸)

ترجمہ: ’’سال کے تمام مہینوں میں اپنی جانوں پر ظلم سے خود کو محفوظ رکھو، خصوصاً ان چار مہینوں میں، ان کو اللہ رب العزت نے قابلِ احترام بنایا ہے، اور ان کی حرمت کو عظمت و بڑائی سے

نوازا ہے، ان میں گناہ کی شدت میں اضافہ ہوجاتا ہے، نیز نیک عمل اور اس کے اجر میں بھی اضافہ ہوجاتا ہے۔''

❸- روزے رکھنے کی ترغیب

اشہرِ حرم میں روزے کی فضیلت سے متعلق آثارِ صحابہؓ سمیت حدیث مرفوع بھی منقول ہے، چنانچہ سنن ابی داوٗد کی روایت ہے:

''ایک شخص نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور عرض کیا کہ اللہ کے رسول! آپ مجھے پہچانتے ہیں؟ نبی ﷺ نے دریافت کیا: تم کون ہو؟ یعنی میں نہیں پہچانتا۔ اس نو وارد نے عرض کیا: میں باہلی (نسبت سے معروف شخص) ہوں، جو آپ کے پاس ہجرت کے پہلے سال حاضرِ خدمت ہوا تھا۔ نبی ﷺ نے فرمایا: تمہیں کیا ہوگیا، تمہاری تو اچھی خاصی حالت تھی؟ جواب دیا: جب سے آپ کے پاس سے گیا ہوں رات کے علاوہ کھایا ہی نہیں (یعنی مسلسل روزے رکھتا رہا ہوں)۔ نبی ﷺ نے فرمایا: تم نے خود کو سزا میں کیوں مبتلا کر رکھا ہے؟ پھر فرمایا: تم صبر کے مہینہ (رمضان) کا روزہ رکھو، اور ہر مہینہ میں ایک روزہ رکھو۔ انہوں نے عرض کیا: اور اضافہ کر دیجیے، کیونکہ مجھ میں مزید روزے رکھنے کی طاقت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: پھر دو دن روزہ رکھ لیا کرو، انہوں نے کہا: اس سے زیادہ کی میرے اندر طاقت ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''تین دن کے روزے رکھ لیا کرو۔ انہوں نے کہا: اضافہ کیجیے، آپ ﷺ نے فرمایا: حرمت والے مہینوں میں روزہ رکھو اور چھوڑ دو، حرمت والے مہینوں میں روزہ رکھو اور چھوڑ دو، حرمت والے مہینوں میں روزہ رکھو اور چھوڑ دو۔'' آپ ﷺ نے اپنی تین انگلیوں سے اشارہ کیا، پہلے بند کیا، پھر انگلیوں کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا۔''(۹)

مذکورہ روایت کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور کبارِ تابعین میں سے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے اس مہینہ میں روزہ رکھنے کا ثبوت ملتا ہے۔(۱۰)

ملاحظہ: ''اشہرِ حرم'' میں چونکہ رجب کا مہینہ بھی داخل ہے، لہٰذا مذکورہ آثار کی روشنی میں اس مہینہ میں روزہ رکھنے کی بھی ترغیب معلوم ہوتی ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ ماہِ رجب میں روزہ سے متعلق متعدد روایات پیش کرکے اُن کی اسنادی حیثیت کو جانچنے کے بعد بطور تبصرہ لکھتے ہیں:

''ماہِ رجب کے روزوں کی فضیلت سے متعلق روایات عام طور پر دو قسم میں منحصر ہیں: ❶- ضعیف روایات، ❷- موضوع روایات''۔(۱۱)

چند سطور بعد اسنادی حیثیت سے ان تمام روایات پر ضُعف کا حکم لگایا ہے۔

لیکن یاد رہے کہ روزہ خود مستقل ایک نیک عمل ہے، اور پھر رجب کا اشہرِ حرم میں ہونا اس کے ثواب میں اضافہ کا باعث ہے، لہٰذا اس مہینہ میں کسی بھی دن کسی خاص و متعین اجر و عقیدہ کے بغیر روزہ رکھنا یقیناً باعثِ خیر وامرِ مستحب ہے۔ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

''دوسری حیثیت رجب میں شہرِ حرام ہونے کی ہے، جو اس (رجب) میں اور بقیہ اشہرِ حرم میں مشترک ہے، پہلی حیثیت سے قطع نظر صرف اس دوسری حیثیت سے اس میں روزہ رکھنے کو مندوب (پسند) فرمایا گیا ہے۔''(۱۲)

۴- آغازِ مہینہ پر دعا کا اہتمام

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کی شعب الایمان کی روایت ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا دخل رجب قال: اللّٰهم بارك لنا في رجب وشعبان وبلغنا رمضان.''(۱۳)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب رجب کے مہینہ کا آغاز فرماتے تو یہ دعا مانگتے: اے اللہ! رجب وشعبان کے مہینہ میں ہمارے لیے برکتیں عطا فرما، اور رمضان کے مہینہ تک پہنچا۔''

فائدہ: اس روایت کی سند میں ایک راوی ''زائدۃ'' پر بعض ائمہ فن نے کلام کیا ہے، بعض نے ثقہ ومعتبر قرار دیا ہے۔(۱۴)، البتہ یہ روایت معنی ومفہوم کے لحاظ سے درست ہے، اور اکابرین کا اس پر عمل بھی رہا ہے۔ نیز فضائل کے باب میں توسع وگنجائش کی بنا پر اس دعا کو پڑھنے میں حرج نہیں۔(۱۵)

اس دعا کی وضاحت کرتے ہوئے ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں:

''اللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا أَيْ: فِيْ طَاعَتِنَا وَعِبَادَتِنَا، فِيْ رَجَبَ وَشَعْبَانَ، وَبَلِّغْنَا رَمَضَانَ، أَيْ: إِدْرَاكَهُ بِتَمَامِهِ، وَالتَّوْفِيْقَ لِصِيَامِهِ وَقِيَامِهِ.''(۱۶)

''اے اللہ! ماہِ رجب وشعبان میں ہماری طاعت وعبادت میں برکت عطا فرما، اور ہمیں رمضان المبارک کے مبارک لمحات کے حصول، اور اس میں روزے وتراویح کی توفیق خاص نصیب فرما۔''

ماہِ رجب سے متعلق عوام الناس میں رائج دیدہ ودانستہ غلطیوں کی اصلاح

①- واقعۂ اسراء کی تاریخ

آج کل عوام میں یہ بات مشہور ہوگئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سفرِ اسراء ومعراج جس میں جنت و

دوزخ کا مشاہدہ، حق تعالیٰ شانہ کا قرب، پانچ نمازوں کا تحفہ اور دیگر بڑی بڑی نشانیوں کی زیارت کا شرف یہ حتمی طور پر ستائیسویں رجب کو حاصل ہوا تھا، جبکہ واقعۂ معراج کے حوالہ سے کسی صحیح حدیث سے متعین دن کا ثبوت نہیں ملتا، عام طور پر اس دن مختلف محفلوں ومجلسوں کا انعقاد کر کے مختلف بدعات کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔ افسوس کہ ان مجالس کی زیرسرپرستی اور انتظامات دین دار سمجھے جانے والے لوگوں کے سپرد ہوتے ہیں، جو اس میں بڑھ چڑھ کر شریکِ کار نظر آتے ہیں۔

سفرِ معراج کس سال، کس مہینے اور کس دن میں واقع ہوا؟ علماء سیرت کے ہاں ان تینوں امور کی تعیین میں شدید اختلاف ہے، تاہم اتنی بات پر اتفاق ہے کہ یہ واقعہ بعثتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اور ہجرت سے قبل پیش آیا۔ نیز مہینہ کی تعیین کے سلسلہ میں بھی پانچ اقوال ملتے ہیں:

۱-ربیع الاول، ۲-ربیع الثانی، ۳-رجب، ۴-رمضان، ۵-شوال۔ (۱۷)

یہاں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ جانثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی جماعت، جن کی تعداد کم وبیش پینتالیس تک ذکر کی گئی ہے، جنہوں نے اجمالاً وتفصیلاً اس واقعہ کو نقل کیا ہے، لیکن اس کے باوجود اس رات میں مخصوص عبادت واہتمام کو نقل کرنا تو دور، اس عظیم سفر کی تاریخ کا تعین ہی نہیں کیا گیا۔

②-ستائیسویں رجب کا روزہ

کسی بھی معتبر سند سے مروی روایت میں اس دن سے متعلق کوئی خاص نفلی عبادت منقول نہیں ہے، لہٰذا اس دن سے متعلق مخصوص ثواب کی نیت سے روزہ رکھنا درست نہیں ہے، فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''ستائیسویں رجب کو جسے عوام ''ہزارہ کا روزہ'' کہتی ہے، اور اس کے روزے کے ثواب کو ہزار روزوں کے برابر تصور کرتی ہے، اس کی کچھ اصل نہیں ہے۔'' (۱۸)

③-رجب کے کونڈے

عوام میں رائج غلط رسوم میں ایک اصلاح کُن رسم کونڈے کی ہے، جس کے لیے ۲۲/رجب کا دن مختص کیا گیا ہے، اور مختلف من گھڑت پس منظر بیان کر کے اس کے اثبات وجواز کی کوشش کی جاتی ہے، جس میں کثیر العیال فقر وفاقہ میں گرفتار شخص کی زندگی کی حضرت جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کے نام پر کونڈے تیار کرنے کی برکت سے معاشی فراخی وانقلاب کی جھوٹی داستان کو بیان کیا جاتا ہے، جبکہ درحقیقت روافض کی جانب سے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات پر خوشی کے اظہار کے لیے ایک حیلہ اختیار کیا جاتا ہے، لہٰذا مسلمانوں کو ایسی رسومات سے

احتراز کرنا چاہیے۔[19]

④-صلاۃ الرغائب

عوام میں یہ بات معروف ہے کہ ستائیسویں رجب کو مغرب کے بعد بارہ رکعت چھ سلام سے مخصوص سورتوں کے ساتھ اس نماز کے بعد مخصوص کلمات سے منقول درود شریف کے اہتمام کو امرِ مندوب سمجھا جاتا ہے، نیز ایک مرفوع روایت پیش کرنے کی ناکام کوشش کی جاتی ہے:

''عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ، قَالَ: "فِيْ رَجَبَ لَيْلَةٌ يُكْتَبُ لِلْعَامِلِ فِيْهَا حَسَنَاتُ مِائَةِ سَنَةٍ، وَذٰلِكَ لِثَلَاثٍ بَقِيْنَ مِنْ رَجَب، فَمَنْ صَلّٰى فِيْهَا اثْنَتَيْ عَشْرَةَ رَكْعَةً، فَقَرَأَ فِيْ كُلِّ رَكْعَةٍ فَاتِحَةَ الْكِتَابِ وَسُوْرَةً مِّنَ الْقُرْآنِ، يَتَشَهَّدُ فِيْ كُلِّ رَكْعَتَيْنِ وَ يُسَلِّمُ فِيْ آخِرِهِنَّ، ثُمَّ يَقُوْلُ: سُبْحَانَ اللهِ، وَالْحَمْدُ لِلهِ، وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، وَاللهُ أَكْبَرُ مِائَةَ مَرَّةٍ، وَ يَسْتَغْفِرُ اللهَ مِائَةَ مَرَّةٍ، وَ يُصَلِّيْ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِائَةَ مَرَّةٍ، وَ يَدْعُوْ لِنَفْسِهٖ مَا شَاءَ مِنْ أَمْرِ دُنْيَاهُ وَآخِرَتِهٖ، وَ يُصْبِحُ صَائِمًا، فَإِنَّ اللهَ يَسْتَجِيْبُ دُعَاءَهٗ كُلَّهٗ إِلَّا أَنْ يَّدْعُوَ فِيْ مَعْصِيَةٍ.''[20]

''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رجب میں ایک رات ہے کہ اس میں نیک عمل کرنے والے کو سو برس کی نیکیوں کا ثواب ہے اور وہ رجب کی ستائیسویں شب ہے، جو اس میں بارہ رکعت پڑھے، ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ اور ایک سورت، اور ہر دو رکعت پر التحیات اور آخر میں بعد سلام سُبْحَانَ اللهِ، وَالْحَمْدُ لِلهِ، وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، وَاللهُ أَكْبَرُ سو بار، استغفار سو بار، درود سو بار، اور اپنی دنیا وآخرت سے جس چیز کی چاہے دعا مانگے اور صبح کو روزہ رکھے تو اللہ تعالیٰ اس کی سب دعائیں قبول فرمائے، سوائے اس دعا کے جو گناہ کے لیے ہو۔''

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اور ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو موضوع قرار دیا ہے۔[21] اور اس کے تمام راویوں کو مجہول قرار دیا ہے۔ اسی طرح علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کے بدعت و جہالت ہونے پر تصریح فرمائی ہے، لہٰذا اس نوعیت کے عمل سے احتراز کرنا لازم ہے۔[22]

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنے فضل وکرم سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کردہ صحیح نہج وفکر سمیت اپنے احکامات پر عمل پیرا ہونے اور دوسروں تک ان کو پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

حواشی وحوالہ جات

١-فيض القدير للمناوي، رقم الحديث: ٤٧١٨، المكتبة التجارية الكبرى، مصر، ١١٣/ ٤

٢-لسان العرب: ٤١٣/ ١، دارصادر، بيروت

٣-شعب الإيمان للبيهقي، فصل، حديث: ٣٥٣٢، مكتبة الرشد للنشر والتوزيع: ٣٣٨/ ٥

٤-فضل رجب لابن عساكر، رقم الحديث : ٨، مؤسسة الريان بيروت، فضائل شهر رجب للخلال، رقم الحديث :١٣، دار ابن حزم: ٦٩/ ١

٥-تبيين العجيب لابن حجرؒ، ص:٢٣، مؤسسة قرطبة

٦-سورة التوبة، آیت نمبر: ٣٦

٧-سنن أبو داؤد،رقم الحديث : ١٩٤٧، المكتبة العصرية، بيروت: ١٩٥/ ٢

٨-تفسير ابن كثير، دارالكتب العلمية، ١٣٠/ ٤، تفسير الطبري، مؤسسة الرسالة: ٢٣٨/ ١٤

٩-سنن أبي داؤد، كتاب الصوم، باب في صوم أشهر الحرم، رقم الحديث : ٢٤٢٨، المكتبة العصرية: ٣٣٢/ ٢

١٠-مصنف عبدالرزاق، كتاب الصوم ، باب في صيام أشهر الحرم: ١٧٨٥٦، المجلس العلمي: ٢٩٢/ ٤، مصنف ابن أبي شيبة، كتاب الصوم، باب ما ذكر في صوم المحرم وأشهر الحرم: ٩٢٢٥، مكتبة الرشد، الرياض: ٣٠٠/ ٢

١١-تبيين العجيب لابن حجرؒ، ص:٣٣، مؤسسة قرطبة

۱۲-امدادالفتاویٰ (مجموعہ فتاویٰ جات حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، مرتب مفتی محمد شفیع عثمانیؒ) ۴/ ۱۳۴، ط: زکریا بک ڈپوانڈیا، الہند

١٣-شعب الإيمان للبيهقي، تخصيص شهر برجب، رقم الحديث:٣٥٣٤

١٤-مجمع الزوائد، باب في فضل شهور البركة وفضل شهررمضان: ١٤٠/ ٣، ط:مكتبة القدسي، القاهرة

١٥-تذكرة الموضوعات للطاهر الفتني :١/ ١١٧، إدارة الطبعات المنيرية

١٦-مرقاة المفاتيح، باب الجمعة: ١٠٢٢/ ٣، رقم الحديث:١٣٦٩، دار الفكر، بيروت

۱۷-تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:شرح الزرقاني على المواهب اللدنية: ٦٧/ ٢،دار الكتب العلمية

۱۸-فتاویٰ دارالعلوم دیوبند مکمل ومدلل:٦/ ٤٠٦، مکتبہ حقانیہ، ملتان

۱۹-تفصیل کے ملاحظہ ہو: فتاویٰ محمودیہ، مجموعہ فتاویٰ جات مفتی محمود حسن گنگوہیؒ (۳/۲۸۱، ۲۸۲) باب البدعات والرسوم، ط: دارالافتاء جامعہ فاروقیہ، کراچی

٢٠-شعب الإيمان للبيهقي، تخصيص شهر رجب بالذكر: ٣٤٦/ ٥، رقم الحديث :٣٥٣١

٢١-تبيين العجيب، ص: ٥٥، نیز حافظ ابن حجرؒ نے اس پر مستقل رسالہ تصنیف کیا ہے جو''الإنصاف لما في صلاة الرغائب من الاختلاف'' کے نام سے موسوم ہے۔

٢٢-شرح صحيح مسلم للنووي، باب كراهية إفراد يوم الجمعة بصوم، رقم الحديث: ٢٦٨٢

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

ریاستِ اسرائیل ..... آخری سانسیں

تحریر: عاری شابیط
یہودی مصنف/صحافی

اسرائیلی اخبار ’’ہارٹیز، ۱۰/اکتوبر‘‘ میں شائع ہونے والا مضمون

معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا واسطہ تاریخ کے مشکل ترین لوگوں سے پڑ گیا ہے اور فلسطینیوں کی زمین پر اُن کا ہی حق تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہم بندگلی میں داخل ہو چکے ہیں اور اب اسرائیلیوں کے لیے ارضِ فلسطین پر قبضہ کا تسلسل، باہر سے آئے یہودیوں کی آبادکاری اور حصولِ امن ممکن نہیں رہا۔ اور اسی طرح صہیونیت میں تحریکِ تجدید، تحفظِ جمہوریت اور مملکت میں آبادی کا پھیلاؤ بھی اب مزید نہیں چل پائیں گے۔ ان حالات میں اس ملک میں رہنے کا کوئی مزا باقی نہیں رہا اور اسی طرح ’’روزنامہ ہارٹیز‘‘ میں لکھنا بھی بدمزہ ہو گیا ہے اور ’’روزنامہ ہارٹیز‘‘ کے مطالعہ میں بھی اب کچھ کشش باقی نہیں رہی۔ اب ہمیں وہی کرنا پڑے گا جو دو سال پہلے ’’روگیل الفار‘‘ نے کیا تھا اور وہ یہ ملک چھوڑ کر باہر چلا گیا تھا۔

مملکتِ اسرائیل نے ہمیں اپنی شناخت نہیں دی، کیونکہ ہر اسرائیلی شہری اور ہر یہودی کے پاس باہر کے کسی نہ کسی ملک کا پاسپورٹ بھی اس کی جیب میں موجود ہے۔ اور اس کی وجہ کوئی مجبوری نہیں ہے، بلکہ اسرائیل کا ہر شہری نفسیاتی طور پر اس عمل کے لیے قائل ہے، تب سمجھ لینا چاہیے کہ کھیل ختم ہو چکا ہے اور آپ کو چاہیے اپنے دوستوں کو خدا حافظ کہہ کر سان فرانسسکو، برلن یا پیرس کو سدھار جائیں۔ اس طرح جرمن قوم پرستوں میں بیٹھ کر، سرزمینِ امریکہ میں امریکی قوم پرستوں میں بیٹھ کر کم از کم وہ آرام سے، سکون اور اطمینان سے دیکھ سکے گا۔

اسرائیل کی ریاست دم توڑ رہی ہے اور اپنی آخری سانسیں لے رہی ہے اور قریب المرگ ہے۔

ہمیں لازمی طور پر تین قدم پیچھے ہٹ کر یہودی جمہوری ریاست کے ڈوبنے کے مناظر دیکھنے ہوں گے، کیونکہ مسائل ابھی تک اپنے حل سے کوسوں دور ہیں۔

شاید ابھی بھی ہم بند گلی سے نکل سکتے ہیں، ابھی بھی ارضِ فلسطین پر قبضہ ختم کیا جا سکتا ہے، ابھی بھی مواقع موجود ہیں کہ صہیونیت کی تازہ تحریک میں اصلاحات ہوسکیں، ابھی بھی جمہوریت کی بحالی کے امکانات موجود ہیں اور ابھی بھی تقسیمِ مملکت ہوسکتی ہے۔

میرا دل کرتا ہے کہ میں بن یامین نیتن یاہو، لیب مین اور نیونازیس کی آنکھیں کھولوں اور انہیں صہیونیت کی تباہی و بربادی کا مشاہدہ کراؤں، اور انہیں باور کراؤں کہ ڈانلڈ ٹرمپ، کوشنر، بائڈن، بارک اوباما اور ہلری کلنٹن کبھی ارضِ فلسطین پر یہ قبضہ ختم نہیں ہونے دیں گے، اور اقوامِ متحدہ اور یورپی یونین بھی غیر ملکی یہودیوں کی آبادکاری کبھی بھی نہیں روکیں گے۔

بس پوری دنیا میں اگر کوئی اسرائیلی سلطنت اور اسرائیلی عوام کو بچا سکتا ہے تو وہ خود اسرائیلی عوام ہیں، جنہیں ایک نوزائدہ سیاسی معاہدے کے تحت بہرحال تسلیم کرنا ہوگا کہ اس ارضِ فلسطین کے اصل مالک فلسطینی ہی ہیں اور یہ انہی کا وطن ہے۔ میں اپنے اسی تیسرے راستے کے موقف کو ہی پرزور طریقے سے پیش کروں گا، اگر ہم یہاں زندہ رہنا چاہتے ہیں اور مرنا نہیں چاہتے۔ اسرائیلی عوام جب سے فلسطین میں آباد ہوئی ہے، تب سے تحریکِ صہیونیت انہیں تاریخی طور پر جھوٹ بول بول کر یہ دھوکا دیے چلی جارہی ہے اور صہیونی کارندے ہولوکاسٹ کو غیر معمولی طور پر بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کے بعد سے ملتِ بنی اسرائیل کو بار بار یہ جھوٹ کہتے چلے آرہے ہیں کہ خداوند خدا نے تم سے ارضِ فلسطین کا وعدہ کر رکھا ہے اور ہیکلِ سلیمانی بھی دراصل مسجدِ اقصیٰ کے نیچے موجود ہے۔ پس اس طرح ٹیکس کی بھاری رقوم چوس چوس کر بھیڑیے ایٹمی طاقت بن گئے۔

اب تو تل اَبیب یونیورسٹی کے محققین اور بہت سے مغربی ماہرین آثارِ قدیمہ بھی کہہ چکے ہیں کہ ہزاروں سال پہلے ہیکلِ سلیمانی کا وجود ختم ہو چکا اور کہیں بھی اس کا کوئی نام ونشان موجود نہیں ہے۔ آخری دفعہ ۱۹۶۸ء میں برطانوی سکول آف آثارِ قدیمہ (British School of Archeology) یروشلم کی ڈائرکٹر کیٹلین کی نوس نے بھی کھدائی کر کے ہیکلِ سلیمانی کے آثار تلاش کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن کچھ بھی نہ ملا۔ جسے اسرائیلی ہیکلِ سلیمانی کہتے ہیں، اس طرح کی عمارت کے کئی نقشے کتابوں میں ملتے ہیں اور ارضِ فلسطین کے متعدد مقامات پر اس کی تعمیر کی شہادتیں بھی میسر ہیں، لیکن مسجدِ اقصیٰ کے نیچے ایسی کسی عمارت کا تصور ایک مفروضے کے سوا کچھ نہیں۔

اس سے قبل انیسویں صدی کے وسط میں بھی ''کیتھلین کینون'' فلسطین اسی لیے آئی تھی کہ عہد نامہ قدیم کی کتب کے مطابق اُس مقام کی نشاندہی کی جاسکے، جہاں یہ عمارت قائم کی گئی تھی۔

کیا یہ اسرائیلیوں کے لیے کسی لعنت سے کم ہے کہ مقدسیوں، خلیلیوں اور نابلوسیوں سے روزانہ چھریوں اور چاقوؤں جیسے تھپڑ اپنے چہروں پر کھائیں یا ان کے ڈرائیورز جفا، حیفہ اور ایسر جاتے ہوئے پتھروں پر پتھر کھاتے ہوئے وہاں پہنچیں۔ اب اسرائیلی جان چکے ہیں کہ فلسطین میں ان کا کوئی مستقبل نہیں ہے، ایسا نہیں ہے کہ ارضِ فلسطین کے کوئی وارث نہ ہوں۔

بائیں بازو کے ایک صہیونی دانشور اور مصنف ''گڈون لیوے'' نے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ یہودیوں کو نہ صرف یہ کہ فلسطینیوں کا حقِ تملیک ماننا پڑے گا، بلکہ ارضِ فلسطین پر انہیں برتری دینا ہوگی، کیونکہ فلسطینی باقی دنیا سے مختلف فطرت کے لوگ ہیں، ہم انہیں بدکار اور نشئی کہتے ہیں اور پھر ہم نے ان کی زمینوں پر قبضہ کیا ہے اور پھر بھی ہم چاہتے ہیں کہ وہ اپنے وطن کو فراموش کردیں، تب ہی وہ ۱۹۸۷ء سے حالتِ مظاہرہ میں ہیں اور ہم انہیں قید خانوں میں بھرتے جارہے ہیں۔

سالوں بعد جب ہم سمجھے کہ اب انہیں سبق سکھایا جاچکا ہے، لیکن ۲۰۰۰ء میں اپنی کھائی گئی زمینیں واگزار کرانے کے لیے وہ مسلح ہوکر ہمارے سامنے آگئے۔ اس کے باوجود ہم نے ان کا محاصرہ جاری رکھا اور ان کے گھروں کو ملیامیٹ کرتے رہے۔

اب کی دفعہ جب انہوں نے ہمارے اوپر میزائل داغنا شروع کردیے تو ہم نے ان کے اور اپنے درمیان بلند بالا دیواریں اور باڑھ لگانے کی منصوبہ بندی کرنی شروع کردی۔ اس کے ردِعمل میں انہوں نے سرنگیں کھودیں اور زیرِ زمین سے ہم پر حملہ آور ہوئے، یہاں تک کہ حالیہ جنگ کے آغاز میں انہوں نے ہماری ریاست اسرائیل کے اندر گھس کر ہمیں قتل کرنا اور مارنا شروع کردیا۔

ہم نے اپنی فکر اور سوچ سے ان کے ساتھ لڑائی شروع کی، لیکن انہوں نے ہمارے خلائی سیارہ ''آموس'' کو ہی جام کردیا۔ وہ مسلسل ہمیں دھمکیوں پر دھمکیاں دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے نوجوان اسرائیلی نشریاتی اداروں کو بھی بند کرکے جام کردیں گے۔ پس ہمیں تاریخ کے مشکل ترین افراد سے پالا پڑ گیا ہے اور انہیں مانے بغیر اور سرزمینِ فلسطین پر اپنا قبضہ ختم کیے بغیر اس مسئلے کا کوئی حل موجود نہیں ہے۔

..... ۞ ..... ۞ ..... ۞ .....

نماز میں اشارہ بالسبابہ (شہادت کی انگلی سے اشارہ کرنے)

کا راجح طریقہ اور کیفیت کیا ہے؟

ادارہ

کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام اس مسئلہ کے بارے میں:

❶-عندالاحناف اشارۃ بالسبابہ کا راجح طریقہ کیا ہے؟ اور ''إلا اللہ'' کہتے وقت انگلی جھکانے کا راجح طریقہ کیا ہے؟ مکمل جھکا کر انگلی ران پر رکھ دینا یا انگلی تھوڑی سی جھکانا اور ران پر نہیں رکھنا؟

❷-تشہد میں ''إلا اللہ'' کہتے وقت اشارہ بالسبابہ (انگلی جھکانے) کی کیفیت کے متعلق حکیم الامتؒ کا آخری موقف کیا تھا؟

الف: انگلی کو تھوڑا سا جھکا دینا، بالکل نہ گرا دینا (مطلب ران سے تھوڑا اوپر ہوا میں جھکانے کی حالت میں رکھنا) عام طور پر حکیم الامتؒ کے اس موقف کو حضرتؒ کی آخری رائے سمجھا جاتا ہے، مثلاً: احسن الفتاویٰ: ۳/ ۳۰-۳۱، فتاویٰ دارالعلوم زکریا: ۲/ ۱۴۱، وغیرہ۔

ب: انگلی کو پوری طرح ران پر جھکا دینا، جیسا کہ مفتی سعید احمد پالن پوری مدظلہ (تحفۃ الالمعی: ۵/ ۳۴۴، امداد الفتاویٰ جدید مطول، حاشیہ: ۱/ ۴۹۵-۵۰۴) اور مفتی شبیر احمد قاسمی مدظلہ (امداد الفتاویٰ جدید مطول، حاشیہ: ۱/ ۴۹۵-۵۰۴) کی آراء ہیں۔

❸-سنن ابوداود کی حدیث نمبر: ۹۹۱

''حدثنا عثمان، يعنى ابن عبد الرحمٰن حدثنا عصام بن دامة، من بني بجيلة عن مالك بن نمير الخزاعي، عن أبيه، قال: رأيت النبي ﷺ واضعاً ذراعه اليمنى على فخذه اليمنى رافعاً اصبعه السبابة قد حناها شيئاً.''

سنن نسائی، حدیث نمبر: ۱۲۷۴

''أخبرني أحمد بن يحيى الصوفي قال حدثنا أبو نعيم، قال حدثنا عصام بن

قدامة الجدلي، قال حدثني مالك بن نمير الخزاعي، من أهل البصرة أن أباه، حدثهٗ أنه رأى رسول الله ﷺ قاعداً في الصلاة واضعاً ذراعه اليمنى على فخذه اليمنى رافعاً اصبعه السبابة قد أحناها شيئاً وهو يدعو.''

ان کی اسنادی حیثیت بشمول الفاظ ''أحناها شيئاً'' کی کیا ہے؟ اوران مذکورہ الفاظ کے معنی میں جو ''جھکنا'' آیا ہے، محدثین یا متقدمین فقہاء نے ان الفاظ کی تشریح کی ہے کہ آیا ان الفاظ سے مراد پورا جھکانا ہے یا قدرے جھکانا اور بالکل نہ گرانا؟ مستفتی: شوکت علی (صوابی)

الجواب باسم ملهم الصواب

منسلکہ سوال نامہ میں مذکور تین سوالوں میں سے ہر ایک سوال کا جواب بالترتیب ذکر کیا جاتا ہے:

❶ - التحیات میں أشهد أن لا إلٰه إلا الله کہتے وقت مسبحہ انگلی سے اشارہ کرنا سنت ہے، احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے اور ائمہ اربعہ سب اس پر متفق ہیں، جس کی مختلف ہیئتیں ہیں، مگر احناف کے نزدیک مختار طریقہ وہ ہے جو وائل ابن حجر رضی اللہ عنہ کی روایت میں مذکور ہے کہ وسطیٰ اور ابہام سے حلقہ بنایا جائے اور خنصر و بنصر کو ہتھیلی سے ملا کر مسبحہ سے اشارہ کیا جائے، چنانچہ مشکوٰۃ شریف میں ہے:

''وعن وائل بن حجر عن رسول الله ﷺ قال: ثم جلس فافترش رجله اليسرى ووضع يده اليسرى علٰى فخذه اليسرى وحد مرفقه اليمنى علٰى فخذه اليمنى وقبض ثنتين وحلق حلقة، ثم رفع اصبعهٗ، فرأيتهٗ يحركها يدعو بها.'' (کتاب الصلاۃ، باب التشہد، الفصل الثانی: ۱/ ۲۸۷، ط: المکتب الاسلامی، بیروت)

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے جملہ طریقوں کو نقل کر کے مذکورہ طریقے کو راجح قرار دیا ہے، چنانچہ ''مرقاة المفاتيح'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''قال الطيبي: وللفقهاء في كيفية عقدها وجوه، أحدها: ماذكرنا (في الطريق الأولى وهو عقد ثلٰثة وخمسين)، والثاني: أن يضم الإبهام إلى الوسطى المقبوضة كالقابض ثلاثًا وعشرين، فإن ابن الزبير رواه كذٰلك. والثالث: أن يقبض الخنصر والبنصر، ويرسل المسبحة، ويحلق الإبهام والوسطى، كما رواه وائل بن حجرؓ اھ، والأخير هو المختار عندنا.''

(مرقاة المفاتيح، كتاب الصلاة، باب التشهد: ۲/ ۷۲۹، ط: دار الفكر، بيروت، لبنان)

محققین کے نزدیک ''لا إلٰه'' پر انگشتِ شہادت کو اُٹھائے اور ''إلا الله'' پر ذرا جھکادے، یعنی انگلی کے اشارہ کو ختم کر کے کچھ نیچے کو رخ کر دیا جائے، لیکن بالکل ران پر نہ رکھے، بلکہ جھکانے کے بعد بھی انگشتِ شہادت ران سے قدرے اُٹھی ہوئی رہنی چاہیے اور یہ ہیئت اخیر تک باقی رہے، سب انگلیاں کھول کر نہ پھیلائی جائیں، چنانچہ مولانا عبد الحی رحمۃ اللہ علیہ نے ''التعليق الممجّد على المؤطا

محمد'' میں اسی کو ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے نقل کیا ہے:

''والصحيح المختار عند جمهور أصحابنا أن يضع كفيه على فخذيه، ثم عند وصوله إلٰى كلمة التوحيد يعقد الخنصر والبنصر ويحلق الوسطى والإبهام، و يشير بالمسبّحة رافعاً لها عند النفي واضعاً عند الإثبات، ثم يستمرّ ذٰلك، لأنهٗ ثبت العقد عند ذٰلك بلا خلاف ولم يوجد أمر بتغييره. فالأصل بقاء الشيئ علٰى ما هو عليه.'' (أبواب الصلاة، باب العبث بالحصى في الصلاة وما يكره من تسويته: ١/٤٦٣، ط: دار القلم، دمشق)

اسی طرح علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

''وفي المحيط أنها سنة، يرفعها عند النفي، و يضعها عند الإثبات، وهو قول أبي حنيفة ومحمد، وكثرت به الآثار والأخبار، فالعمل به أولٰى.'' (كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، فصل في بيان تاليف الصلاة إلى انتهائها، فروع قرأ بالفارسية أو التوراة أو الإنجيل، ج:١، ص:٥٠٨، ط: سعيد)

اسی طرح علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ شرح ابی داود میں تحریر فرماتے ہیں:

''نا عبد الله بن محمد النفيلي: نا عثمان يعنى: ابن عبد الرحمٰن نا عصام بن قدامة من بني بجلة، عن مالك بن نمير الخزاعي، عن أبيه قال: رأيت النبى عليه السلام واضعا ذراعه اليمنى علٰى فخذه اليمنى رافعا اصبعه السبابة قد حناها شيئا. قوله: "حناها" بفتح الحاء المهملة والنون أي: أمالها شيئا.''

(كتاب الصلاة، باب: الإشارة في التشهد، ج:٤، ص:٢٧٥، ط: مكتبة الرشد، الرياض)

❷- اشارہ بالسبابۃ کی کیفیت کے متعلق حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کا پہلا موقف وہ تھا جس کو حضرتؒ نے بہشتی زیور حصہ دوم میں لکھا ہے کہ تشہد پڑھتے وقت جب کلمہ پر پہنچے تو بیچ کی انگلی اور انگوٹھے سے حلقہ بنا کر کلمہ کی انگلی کو اُٹھا دیوے اور سلام پھیرنے تک اسی طرح اُٹھائے رہے۔ لیکن بعد میں حضرتؒ سے ایک سائل نے مفصل سوال کیا، جس کے بعد حضرتؒ نے سابقہ موقف (جو بہشتی زیور حصہ دوم میں اشارہ بالسبابۃ کی کیفیت سے متعلق تھا) سے رجوع کیا اور یہ موقف اختیار کیا کہ: تشہد میں ''لا إلٰه'' کے وقت انگلی اُٹھادے اور ''إلا الله'' پر جھکادے، مگر عقد اور حلقہ کی ہیئت کو آخری نماز تک باقی رکھے، چنانچہ حضرتؒ سائل کے جواب میں لکھتے ہیں:

''الجواب: واقعی بقاء اشارہ میں روایت ترمذی کی صریح نہیں، گو محتمل ہے اور ملا علی قاریؒ کی عبارت کا مدلول بھی واقعی قبضِ اصابع و بسطِ سبابہ ہی کا بقاء ہے، نہ کہ اشارہ کا۔ پس بہشتی زیور کے مضمون سے رجوع کرتا ہوں اور اس کو اس طرح بدلتا ہوں تشہد میں ''لا إلٰه'' کے وقت انگلی اُٹھاوے اور ''إلا الله'' پر جھکاوے، مگر عقد اور حلقہ کی ہیئت کو آخر نماز تک باقی

رکھے۔ وجزاکم الله علی ھٰذا التنبیه.''

(امداد الفتاوی، کتاب الصلاۃ، تشہد کے وقت رفع سبابہ کی حکمت، ج:۱، ص:۱۸۷، ط: مکتبہ دار العلوم کراچی)

باقی رہا یہ کہ انگلی کس قدر جھکائی جائے؟ تو اس بارے میں حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ہی موقف ہماری نظروں سے گزرا ہے کہ انگلی قدرے جھکائی جائے، بالکلیہ اس طرح نہ گرائی جائے کہ ران پر رکھا جائے، چنانچہ حضرتؒ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

''ذرا جھکا دے، یہ معنی ہے گرانے کے اور حلقہ بنائے رکھے اور بالکلیہ نہ گرادے،''صرح به ملا علي قاري في رسالة تزئين العبارة بتحسين الإشارة.'' (امداد الفتاوی:۱/۱۴۲)

❸- ابوداؤد اور نسائی شریف کی مذکورہ روایت میں سند کے اندر''مالك بن نمير الخزاعي'' متکلم فیہ راوی موجود ہے، جس کے بارے میں محدثین کی آراء باہم مختلف ہیں، بعض نے توثیق کی ہے، چنانچہ حافظ ابن حجرؒ نے ان تمام اقوال کے پیش نظر ان کو مقبول قرار دیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی روایت احکام کے باب میں قابلِ قبول ہے، اور اس سے اس باب میں استدلال بھی کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ علامہ عینیؒ اور ملا علی قاریؒ نے اس روایت سے اشارہ کے بعد کی کیفیت کے متعلق استدلال کیا ہے، چنانچہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ ''تقريب التهذيب'' میں فرماتے ہیں:

''مالك بن نمير الخزاعي مقبول.'' (ج:۲،ص:۴۷۴،باب ذکر حروف المیم)

اشارہ کے بعد کی کیفیت کے متعلق فقہائے کرام کی عبارات میں ''یضعها'' کے الفاظ ہیں، اس میں شہادت کی انگلی ران پر رکھی جائے یا اُٹھا کر رکھی جائے، اس کی تصریح موجود نہیں۔

البتہ''وقد حناها شيئا'' کے جملے سے قدرے جھکانے کا مطلب نکلتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ران سے قدرے اُٹھا کر رکھنا بہتر ہے، جیسا کہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے ''تزيين العبارة بتحسين الإشارة''، ص:۸، اور علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح ابی داؤد، جلد:۴ / ۲۷۸، میں ابوداؤد اور نسائی شریف کی روایت: ''رافعا اصبعه السبابة وقد حناها شيئا'' ذکر کرنے کے بعد ''أي أمالها'' سے اس کی تصریح فرمائی ہے کہ تشہد والی انگلی کو قدرے جھکایا جائے، اس روایت میں ران پر رکھنے یا نہ رکھنے کی کوئی تصریح نہیں، اس لیے ران پر رکھنا چاہے تو یہ بھی جائز ہے، جیسا کہ بعض اہلِ علم کی رائے ہے، تاہم حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی آخری رائے زیادہ قوی معلوم ہوتی ہے۔ فقط واللہ اعلم

الجواب صحیح	الجواب صحیح	کتبہ
ابوبکر سعید الرحمٰن	محمد عبد القادر	محمد خالد
		تخصصِ فقہِ اسلامی

جامعہ علومِ اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن، کراچی

نَقدُ و نَظَر

تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخوں کا آنا ضروری ہے

ادارہ

زادُ الفقیر اردو شرح مقدمہ مسلم

مؤلف: مولانا محمد جمیل صاحب۔ صفحات: ۳۱۲۔ قیمت: ۲۵۰۔ ایڈیشن: اول۔ سن اشاعت: ۱۴۴۴ھ-2022ء۔ ناشر: مکتبہ رشیدیہ، سرکی روڈ، کوئٹہ۔ رابطہ نمبر: 0334-2793808

صحاحِ ستہ کی مشہور و معروف مستندترین کتاب صحیح مسلم اپنے حسنِ ترتیب میں تمام صحاح سے ممتاز ہے، اس کے ساتھ ساتھ اس کی ایک نمایاں اور منفرد خصوصیت یہ ہے کہ اس کے شروع میں علم حدیث کی اہمیت وفضیلت اور متعلقاتِ حدیث پر مشتمل ایک معرکۃ الآراء اور محققانہ مقدمہ ہے، جو باقی صحاح کے شروع میں نہیں ہے۔ یہ مقدمہ علم حدیث پڑھنے اور پڑھانے والوں کے لیے انتہائی اہمیت رکھتا ہے، ہر حدیث پڑھنے والے اور پڑھانے والے کا اس سے واسطہ پڑتا ہے۔ اس مقدمہ میں بالخصوص حدیث معنعن کی بحث معرکۃ الآراء ہے، حدیث کی صحت کے لیے سند کا اتصال ضروری ہے، یعنی تمام راویوں نے وہ روایت اپنے اپنے شیخ سے سنی ہو، اس مسئلہ میں تمام ائمہ محدثین کا اتفاق ہے، پھر اتصال کے ثبوت کے لیے راویوں کے درمیان لقاء کا ثبوت ضروری ہے؟ یا صرف معاصرت یعنی امکانِ لقاء کافی ہے؟ اس میں محدثین کا اختلاف مشہور ہے۔ امام مسلمؒ نے اپنے مسلک یعنی امکانِ لقاء کافی ہونے کو مدلل طور پر بیان کیا ہے، اور فریقِ مخالف پر زوردار طریقے سے رد کیا ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب صحیح مسلم کے اسی مقدمہ کی شرح ہے، جسے جامعہ اسلامیہ بحر العلوم کوئٹہ کے استاذِ حدیث جناب مولانا محمد جمیل صاحب نے تالیف کیا ہے، مولانا حفیظ اللہ صاحب استاذِ حدیث جامعہ امدادیہ (سریاب مل کوئٹہ) نے اس پر نظرِ ثانی کی ہے۔ کتاب پڑھنے سے اندازہ ہوا کہ تشریح عمدہ اور سیر حاصل کی گئی ہے۔ فہرست عنوانات بھی بہترین ہے۔ البتہ کتاب کا کاغذ ہلکا ہے۔ عنوانات اور اقتباسات میں سیٹنگ کی رعایت نہیں رکھی گئی اور علاماتِ ترقیم کا تو بالکل خیال نہیں رکھا گیا۔ یہ شرح متعلقاتِ حدیث میں ایک عمدہ اور بہترین اضافہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے اور اس کا نفع عام فرمائے، آمین

..... ❀ ..... ❀ ..... ❀ .....